پھندا

طارق اسماعیل ساگر

محکمہ موسمیات سے تیس سال تک پہلے کلرکی اور پھر ہیڈ کلرکی کرنے کے بعد جب میرا باپ بالاخر ریٹائرڈ ہوا تو جاتے جاتے اپنی غلامی کا طوق میرے گلے میں ڈال گیا۔ جی ہاں ---- کیا کر لیا تھا میرے باپ نے تیس سال تک ایمانداری کے جوہر دکھانے کے بعد ----!

بس یہی کہ اپنے افسران اعلیٰ کی منت سماجت کر کے اپنی خالی کرسی پر مجھے بٹھا دیا۔ بالکل یوں جیسے جیل میں سزائے موت والے قیدی کی بیڑیاں اتارنے کے بعد دوسرے سزائے موت کے منتظر کو پہنا دی جائیں ----!

میں نے کئی مرتبہ اپنے والد سے دریافت کیا تھا کہ انہوں نے نوکری کے لیے اس منحوس محکمے کا انتخاب کیوں کیا؟

"بیٹا! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ یہاں بے ایمان ہونے سے محفوظ رہنے کا زیادہ مواقع میسر ہیں۔ آخر انسان کو مرجانا ہے ---- آخرت کا سامان اس دنیا میں کرنا ہے میرے بچے! برخوردار یہ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے ---- انسان کی کمائی اس کی جائیداد' دولت اور اثر و رسوخ نہیں ہوتا اس کے اعمال ہوتے ہیں۔ نیک اعمال ----" بس! اس سے زیادہ سننے کی تاب مجھ میں نہیں ہوتی تھی اور میں اپنے مقدر کو کوستا باہر نکل جاتا۔

خدا جانے میرے والد کے دماغ میں ایمانداری کا کیڑا کب گھس گیا تھا کہ جس نے ہماری ساری زندگی کو اندر ہی اندر کھا کر کھوکھلا کر دیا ----!!

میرے والدین لدھیانہ کے مہاجر تھے۔ اور اس شہر بے مثال میں آ کر بسے ----

میں جب کبھی اپنی ماں سے کہتا کہ تمہیں رہنے کے لیے اس سے بہتر مکان کوئی نہیں ملا تھا-----

"بیٹا وہاں لدھیانے میں بس ہم ایسے ہی مکان میں رہتے تھے ----- یہاں اللہ نے اس سے بہتر دے دیا ----- خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے"-----

خدا جانے شکر و صبر کا کون سا فلسفہ انہوں نے اپنا لیا تھا----- میرے والد کی مثال اس شخص کی سی تھی جو اپنی دونوں ٹانگیں ٹوٹ جانے پر اپنے ہاتھ سلامت رہنے پر خدا کا بار بار شکر ادا کرتا رہتا ہے ----- یہ جانتے ہوئے بھی کہ ٹانگوں کے بغیر اب اس کو اپنے ہاتھوں سے ٹانگوں کا کام لینا پڑے گا-----!

دوران ملازمت میرے والد صاحب نے تین محکمے تبدیل کیے تھے۔ پہلے ریلوے میں کلرک ہوئے۔ وہاں سے واپڈا پھر محکمہ شناختی کارڈ اور اب یہاں محکمہ موسمیات سے ریٹائرڈ ہو گئے-----

لوگ جن کرسیوں کے لیے بڑی کرسی والوں کے سامنے ایڑیاں رگڑتے تھے۔ والد صاحب کو محکمے والے زبردستی اس کرسی پر بٹھاتے اور وہ اس بہتی گنگا میں اپنے ہاتھ رنگنے کی بجائے دن رات اس تگ و دو میں لگے رہتے کہ ان کی جان یہاں سے چھوٹ جائے۔

ان کی ساری زندگی کی کمائی اپنے محلے کی مسجد کمیٹی کی ممبری اور اندرون شہر کا یہ بوسیدہ مکان تھا۔ جس کی اوپر والی منزل پر شیر فروش تھے اور نچلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور پر دین محمد پہلوان اور اس کا بندر-----" عجیب شخص تھا یہ دین محمد بھی-----!

خدا جانے اس کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے کبھی اکھاڑے کا منہ بھی دیکھا تھا یا نہیں ----- اس کے منہ پر تو صرف مونچھیں ہی ایک ایسی نشان تھی جسے وہ بطور قسم پیش کر سکتا-----

گھنی مونچھوں کے پیچھے اس کے ہونٹوں سے پھیلتے نقلی دانت سر پر لگی مہندی اور سانپ ایسی باریک آنکھوں میں پھیلتا سرمہ دیکھ کر کسی بھی شریف آدمی کا جی بے اختیار اس پر لعنت بھیجنے کو چاہتا تھا-----!

پندرہ سال سے وہ ہمارا کرایہ دار تھا اور پندرہ سال سے ایک ہی کرایہ ادا کر رہا تھا -----! جب بھی میں اپنے والد صاحب سے کہتا کہ اس مردود کو نکال کر کوئی ڈھنگ کا کرایہ دار رکھ لیں تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"بیٹا بے چارے کی تین جوان بیٹیاں ہیں ----- کہاں مارا مارا پھرے گا ----- ہمارا کیا لیتا ہے ----- دو بیٹیاں بیانے کے لائق بیٹھی ہیں-----"

حیرت کی بات یہ تھی کہ سوائے دین محمد عرف دینو پہلوان کے باقی سارے محلے کو اس کی بیٹیوں کی فکر رہتی تھی۔

اور خود دینو پہلوان-----

اس کمبخت کا بس چلتا تو اس محلے کی تمام اپنی صاحبزادیوں کی ہم عمر لڑکیوں سے یارانہ گانٹھ لیتا-----

میں نے اپنے ہوش میں اس کے منہ سے ہمارے مکان کے سامنے سے گزرنے والی کسی لڑکی یا عورت سے متعلق کلمہ خیر نہیں سنا تھا-----! کنواریوں کی گود میں بچہ بٹھا دینا تو اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا----- اس کے نزدیک ہماری گلی سے گزرنے والی ہر عورت اور لڑکی بدکردار آوارہ اور عیاش تھی ----- ہر تیسری عورت سے متعلق وہ اپنے ساتھ ناجائز تعلق کا دعویٰ اپنی مہندی رنگی مونچھوں پر الٹا ہاتھ پھیر کر داغ دیتا-----!

"اوئے تم ہو ڈالڈا گھی کی پیدائش ----- ہم نے پرانی خوراکیں کھائی ہوئی ہیں ----- ایک مرتبہ جس عورت کے بدن کو چھو دیں ----- ساری زندگی کے لیے اپنی غلام

ہو جاتی ہے ----- مولوی باؤ بڑے بڑے کشتے ہیں اپنے پاس ----- جب کبھی میں اس سے کرایہ لینے جاتا تو وہ وہاں پہلے سے موجود محلے کی کسی عورت کے پاؤں یا ہاتھ پر پٹی باندھ کر اسے فارغ کرنے کے بعد اس سے متعلق کوئی نہ کوئی بڑ ہانک رہا ہوتا اور مجھے "ڈاڈا کھی" کا طعنہ دینا کبھی نہ بھولتا تھا-----

والد صاحب چونکہ پابند صوم و صلوٰۃ تھے ----- اس لیے مجھ پر بھی سارے محلے نے "مولوی" کا لیبل چپکا دیا تھا ---- حالانکہ میں نے ساری زندگی لنڈے بازار کی پتلونوں اور قمیضوں کے سوا کچھ نہیں پہنا تھا۔ شاید اسی مناسبت سے وہ مجھے "باؤ مولوی" کہنے لگے تھے -----!

پہلوان نے ہمیں ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ دینا ہوتا تھا جس کے لیے مجھے اور میری ماں کو مہینے میں ڈیڑھ سو چکر اس منحوس کے ہاں لگانے پڑتے تھے۔ اس پر کبھی ہمیں یک مشت کرایہ نہیں ملتا تھا۔ ڈیڑھ سو روپیہ بھی وہ کم از کم دس قسطوں میں دیا کرتا-----

جب کبھی میں طیش کھاتا والد اور والدہ آڑے آجاتے -----!

پہلوان نے ہمارے مکان کی گراؤنڈ فلور پر موجود دو کمروں میں اپنی دو بیٹیاں اور ایک بھاری بھرکم بیوی ہی کو نہیں رکھا ہوا تھا ---- اپنا خاندانی مطب بھی وہ یہیں چلا رہا تھا -----!

ایک کمرے کے درمیان میں چادریں باندھ کر اس نے چادر پر خدا جانے کس زمانے کی چھپی ہوئی بڑے بڑے پہلوانوں کی تصاویر کو پلاسٹک کے کاغذ میں لیمینیشن کر کے سجا رکھا تھا ----- یہ تصویریں شاید اس زمانے کی تھیں جب "لیتھو" کی چھپائی پتھر کی پلیٹوں پر ہوا کرتی تھی ----- ان پہلوانوں کے چہرے ایک تو پرنٹنگ نے ہی بگاڑ دیے تھے اور مرے پر سو درے ان کی تصویروں پر پہلوان کے منحوس ہاتھوں سے چپکا تیل جما رہتا تھا ---- اگر ان ننگ دھڑنگ گوشت کے پہاڑوں کے ہاتھوں میں بڑے

بڑے گرز نہ پکڑے ہوتے تو وہ پہلوانوں کی بجائے کسی پرانے سرکس کے مسخرے دکھائی دیتے -----

ہر نئے گاہک کو دینو پہلوان ان تصاویر کے حوالے سے کوئی نہ کوئی کہانی ایسی ضرور سنایا کرتا تھا جس سے اس کا مقصد یہی ہوتا کہ یہ سب اس کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلوانوں کی تصویر کے نیچے اس نے ایک چھوٹی سی سالخوردہ الماری رکھی ہوئی تھی جس میں رنگ برنگ تیل کی شیشیاں، کچھ مرہم پٹیاں اور کالے رنگ کی سیال سی مرہم رکھی ہوئی تھی -----

یہ اس کا 'مطب' تھا جہاں ٹوٹی ہڈیوں، پرانی موچ، درد اور پرانی خارش کا علاج کیا جاتا تھا -----

دینو پہلوان کی شہرت بظاہر تو 'خاندانی جراح' کی تھی لیکن کینسر سے نامردی تک کوئی ایسی بیماری نہیں تھی جس کا علاج اس کے پاس نہ رہا ہو -----

وہ اپنے پاس 'خاندانی نسخوں' کی بڑائی ہر جاہل کے سامنے ہانک دیتا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی نہ کوئی بٹیرہ اس کی نیم حکیمی کے باوجود اس کے پلڑے میں پھنسا رہتا تھا -----

درجنوں لوگوں کو تو میں جانتا تھا جو پہلوان کے علاج کے بعد 'نمونہ عبرت' بن گئے تھے۔ ان میں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں والے بھی تھے اور سرعت انزال اور نامردی کے مریض بھی ----- جو اب پیچیدہ بیماریوں کا شکار ہو کر در بدر خاک بسر ہو رہے تھے -----

پہلوان کمال کا ماہر نفسیات تھا -----

اس نے جتنے مریضوں کا بیڑہ غرق کیا تھا انہیں اس انداز سے ذہنی بلیک میلنگ کے چکر میں پھنسایا ہوا تھا کہ بے چارے اس کے ہاتھوں قتل ہونے پر بھی اف نہ کرتے

اور اسے مقدر کا مانا جان کر قبول کر لیتے -----!

اس بات کا علم تو مجھے بعد میں ہوا کہ پہلوان کی دکانداری کا راز اس کی جنسی اور لچھے دار گفتگو سے زیادہ اس کی جوان بیٹیاں تھیں ----- اس کی دکان میں بیٹھے ہر گاہک کی نظر سب سے پہلے پہلوان کی اس 'کرت کمائی' پر پڑتی تھی اور ان کو ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد ہر 'مریض' کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ پہلوان کا "مستقل مریض" بنا رہے -----!

پہلوان کی بیوی 'دارو' اپنے زمانے میں ضرور کوئی ڈھنگ کی عورت رہی ہو گی ----- اس کے جسمانی کھنڈرات عمارت کے عظیم الشان ماضی کی گواہی دیتے تھے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت اس کی تینوں سانولے رنگ کی بیٹیاں تھیں -----

دارو کی شہرت 'رشتے کروانے' والی کی تھی -----!

لیکن -----

اپنے خاوند کی طرح اس نے بھی اپنے دھندے میں ہر حرام کاری روا رکھی تھی۔ جن کی بیٹیوں یا بیٹوں میں کوئی بھی نقص ہوتا وہ دارو کے بہترین شکار ہوتے تھے۔

"بی بی ہمارا کام تو ایک مرتبہ سنجوگ ملا دینا ہے ----- ہماری طرف سے ڈولی میں قدم رکھتے ہی رنڈی ہو جائے ----- ہمیں کیا لینا دینا" -----

وہ اکثر میری ماں سے کہا کرتی تھی۔

میرا جی چاہتا ہے اس کے پوپلے منہ کو نوچ لوں جس میں یا تو پان کی پیک بھری ہوتی یا پھر سارے محلے کی چغلیاں -----

کمبخت بالکل اپنے خاوند کی کاپی تھی -----



ہمارے گھر کو جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ جس کی سیڑھیوں کو پہلوان کی بیٹیوں

نے کچن بنا رکھا تھا ----- مٹی کے تیل کا چولہا جلا کر وہ سیڑھیوں میں بیٹھ جاتیں اور ٹرانسسٹر ریڈیو پورے والیم سے کھول دیتیں -----

لیکن -----

اس صورت حال پر سوائے میرے اور کوئی احتجاج نہ کرتا ----- میری بہن کو تو والد صاحب نے بچپن ہی سے سلائی کڑھائی اور قرآن پاک کی تعلیم پر لگایا ہوا تھا اور خود والدین صبر و رضا کا پیکر بنے میرے سینے پر مونگ دلتے رہتے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی میری کسی شکایت کا نوٹس ہی نہیں لیا ----- عموماً ہر بات میں میری ہی غلطی نکال دیا کرتے تھے یا پھر مجھے صبر کی تلقین کر کے وہاں سے احتجاجاً چلے جانے پر مجبور کر دیتے -----

میں نے جیسے تیسے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ یہ الگ بات کہ میٹرک پاس کرتے ہوئے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ آٹھویں' نویں اور پھر دسویں جماعت تینوں میں نے پانچ سال میں پاس کی تھیں۔

اس کی یہ وجہ یہ نہیں کہ میں نالائق تھا۔ نہ ہی یہ کہ میں محنت سے جی چراتا تھا اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ شعور کی آنکھ میں نے جس ماحول میں کھولی تھی وہاں میرے اردگرد ایسی ایسی "تلخیاں" سچائیاں بکھری پڑی تھیں کہ جنہیں ہضم کرنا میرے لیے گو کہ کاردار تھا۔ لیکن ----- انہوں نے مجھے ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند بنا دیا -----

مجھے یہ سمجھ آگئی کہ میرے والد کی ناکامی کا راز اسی کی ایمانداری اور محنت میں پنہاں ہے جب کہ میرے باپ نے ہمیں ساری زندگی ایمانداری اور محنت کا درس دیا تھا۔

میں نے یہ جان لیا کہ زندگی کے اس ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے آدمی

کا بہت اچھا کوہ پیما ہونا ضروری ہے۔ اسے پہاڑوں کا دریاؤں کا' موسموں کا علم جاننا لازم ہے۔ صرف تعلیم اور ایمانداری ایسے ہتھیار نہیں جن سے یہ کوہ گراں سر کیا جائے



میرے والد کا تعلق سفید پوش خاندان سے تھا لیکن میرے دادا اور دو چچا بھی پڑھے لکھے اور سرکاری ملازم تھے ----- تعلیم میرے دودھیال میں تب بھی تھی جب وہ انگریز کے غلام تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بے چارے کبھی ترقی نہ کرتے اور چھوٹے سرکاری منصوبوں ہی سے ریٹائر ہو گئے۔

مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ میرے باپ کا تعلق کسی زمیندار یا جاگیردار گھرانے سے نہیں۔

لیکن -----

یہ جو محمد یار اور اس کے لڑکوں نے آدھے شہر کو اپنی ملکیت بنا رکھا تھا ان کے اجداد بھی کوئی "راٹھ" نہیں تھے -----

ہندوؤں کے مزارعے تھے۔

ان کے پاس ایسی کون سی گیڈر سنگھی آگئی تھی جس نے انہیں میاں صاحب اور چوہدری صاحب اور ملک صاحب بنا دیا تھا۔ جس نے انہیں مزارعوں سے جاگیردار بنا دیا تھا۔ میرے والد نے قیام پاکستان سے پہلے آئی کام پاس کیا تھا۔ محمد یار کے تو باپ نے ہی سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا اور وہ نہ صرف ہمارے علاقے کا کونسلر بلکہ زکوٰۃ اور مسجد کمیٹی کا چیئرمین بھی تھا-----

دینو پہلوان کی زبانی مجھے محمد یار کونسلر کے کرتوت کا علم ہوتا رہتا تھا----- گو کہ دینو پہلوان بھی کوئی ایسا قابل اعتبار "سورس" نہیں تھا۔

لیکن -----

میں کوئی اندھا نہیں تھا-----

میں جانتا تھا کہ ارد گرد کے محلوں کی نوجوان بیوائیں جو اس موذی سے سرکاری زکوٰۃ وصول کرتی تھیں انہیں یہ زکوٰۃ یونہی نہیں مل جاتی تھی۔

کونسلر محمد یار ان کے جسموں کو گدھ کی طرح نوچ کر اپنا معاوضہ وصول کیا کرتا تھا۔

اس کے دونوں لڑکے چار ہاتھوں سے سارے شہر کو لوٹ رہے تھے -----

بڑے بڑے سرکاری ٹھیکے حاصل کر لینا تو ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کے ہر ٹھیکے کی تکمیل پر ان کے خلاف ایک مقدمہ بد دیانتی کا قائم ہوتا اور پھر خارج ہو جاتا۔

آج تک ان موذیوں کو سزا نہیں ملی تھی۔

مجھے علم تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے -----

مجھے رہ رہ کر اس بات کا غصہ آتا تھا کہ اس ایمانداری اور دیانت داری کے چکر میں میرے باپ نے ہمیں کیوں رگڑا دے دیا ----- اب وہ "روم" کا باشندہ بن ہی گیا تھا تو اس نے 'رومیوں' کی طرح خود کو کیوں نہیں ڈھالا۔

حالات نے میرے لیے زندگی کو آغاز ہی سے رومن اکھاڑہ بنا دیا تھا-----

میں نے جان لیا کہ یہ دنیا طاقتور کے لیے ہے کمزور کے لیے نہیں ----- یہاں کی ہر چھوٹی مچھلی کو بالآخر بڑی مچھلی نگل جاتی ہے۔

جس فلسفہ حیات کی سمجھ مجھے اتنی جلدی آگئی اس کی سمجھ میرے والد کو اپنی سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی نہ آسکی-----

ان کی سوئی ابھی تک ایک ہی ریکارڈ پر اٹکی ہوئی تھی کہ ایمانداری اور محنت ضرور رنگ لاتی ہے۔

لیکن کب؟
جب کبھی میں نے اپنے والد سے یہ سوال پوچھا وہ مجھے گمراہی اور بے راہ روی کا
طعنہ دے کر اپنی نظروں سے کے سامنے ہٹ جانے کا حکم دیا کرتے۔ اور میں -----
ان کی نظروں کے سامنے سے ہٹ جاتا۔

○ ○



چار مرتبہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد بالاخر مجھے کامیابی نصیب ہو ہی گئی
ہمارے محلے کی سب سے بڑی دانش گاہ بشیرے نائی کی دکانِ تھی۔ جہاں تین اخبار اور
ان کی خبروں پر تبصرہ کرنے والے تین سو سے زیادہ انواع و اقسام کے انسان نما جانور
آتے رہتے تھے
اس روز بھی بشیرے کی دوکان پر شیو کروانے گیا تھا جب میں نے یہاں کی 'گڈی
سائیں' کی آمد کی خبر سنی -----
"بڑی دھوم مچی ہے مولوی باؤ آج کل ----- محلے کی تمام عورتیں سائیں جی کی
مرید بن رہی ہیں ----- میں تو کہتا ہوں یار تم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لو۔
بشیرے نے استرے کی دھار میری گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔
"چل چل شیو کر ----- مجھے جلدی جانا ہے -----"
میں نے اسے ٹرخانے کے لیے کہہ دیا۔ حالانکہ گڈی سائیں کے نام نے مجھے
متجسس ضرور کر دیا تھا۔
"آج کل تو تمہارے پہلوان کی بیوی اس کی خلیفہ بنی ہوئی ہے ----- بشیرے نے
اگلی اہم خبریں میرے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا۔ داری کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا -----
لیکن -----

میں نے پھر اس کا داؤ فال دیا۔
اچھا یار جائے جہنم میں ----- مجھے تو پہلے ہی دفتر سے دیر ہو رہی ہے "-----
میں نے دو روپے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اپنی راہ لی اور یہاں سے سیدھا
آفس آگیا۔



سارا دن گڈی سائیں میرے دماغ میں اٹکا رہا-----

اگر داری اس کی خلیفہ بن گئی تھی تو ضرور دال میں کچھ کالا ہو گا۔ دفتر کے اوقات ختم ہونے تک میں یہی سوچتا رہا پھر اپنے کمرے سے باہر آگیا-----

معمول کے مطابق آج بھی میں نے تین چار سو روپیہ کما لیے تھے----- یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میری ڈیوٹی پبلک ڈیلنگ سے متعلق ہو گئی تھی۔ گو کہ اس محکمے میں حرام کاری کے اتنے زیادہ چانسز نہیں تھے۔

لیکن-----

بدنیتی شرط ہے مواقعے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا-----

اس روز جب میں گھر واپس پہنچا تو گلی کی نکڑ پر ہی مجھے اپنے گھر سے ڈھولک اور تاشے کی تھاپ پر قوال نما کورس گانے کی آوازوں نے چونکا دیا۔ گھر کے دروازے پر محلے کی تین چار عورتیں اور مرد کھڑے تھے اور وہ سب جوتیاں اتار کر اندر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

میرا تجسس مزید بڑھا-----

آگے جا کر دیکھا تو اندر عجیب سماں تھا۔ پہلوان نے اپنی دکانداری سمیٹ لی تھی

اور وہ سارے کمرے میں اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی----- کمرے کے درمیان لگے موٹے سے شہتیر پر تازہ پھولوں کے ہار بندھے تھے پھلوار کے ایک کونے میں موجود نواڑی پلنگ پر نیا کھیس بچھایا ہوا تھا جس پر ایک درمیانی عمر کے پیر صاحب براجمان تھے-----

یہ گڈی سائیں تھا-----

اس کے بالوں کی لٹیں کندھوں پر پڑی تھیں۔ آنکھیں شاید کسی نشے کے اثر سے سرخ ہو رہی تھیں اور داڑھی کے بال الجھے ہوئے تھے لیکن ان میں باقاعدگی دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی اداکار کو میک اپ کروا کر بٹھایا گیا ہو۔

گڈی سائیں نے سبز رنگ کا ریشمی لمبا سا کرتا پہن رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مختلف انگوٹھیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سرمہ رنگ بہار دکھا رہا تھا۔ جب کہ گلے میں خوبصورت منکوں کی مالا اور دونوں کندھوں پر بڑے سلیقے سے گہرے سرخ رنگ کا ریشمی رومال رکھا تھا----- سر پر اس نے کیلنڈروں پر بنی بزرگوں کی تصویر جیسی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر پہلی نظر میں مجھے یہی لگا تھا کہ عموماً عرس وغیرہ کے جو اشتہارات چھاپ کر دیواروں پر چسپاں کیے جاتے ہیں ان پر ایسے ہی بزرگوں کی تصاویر بنی ہوتی ہیں۔

"پاکھنڈی"-----

میرے دل سے پہلی آواز اٹھی-----

"اسلام علیکم سائیں جی"

"اسلام علیکم سائیں جی"

دائیں بائیں سے یہی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہر آنے والا دروازے پر ہی جوتی اتار دیتا اور نیاز مندی کے انداز میں جھک کر گڈی سائیں تک پہنچتا تھا۔ قریب

آنے پر گڈی سائیں جس کی آنکھیں کسی نشے کے اثر سے خوابیدہ سی ہو رہی تھیں اپنا ہاتھ آگے بڑھادیتا اور آنے والا اس کو بے وقوفوں کی طرح چومنے لگتا-----

میں تو شاید دروازے میں سے اس پاکھنڈی پر لعنت بھیج کر اوپر چلا جاتا لیکن برا ہوا اس سانولی رنگ والی اکہیرے بدن اور سیاہ آنکھوں والی مراثن کا جس نے میرے قدموں کو اپنی جگہ یوں جمادیا جیسے کبھی کبھی تماشا دکھانے والے مداری کوئی منتر پڑھ کر اپنے مقابل کو باندھ دیا کرتے ہیں۔

اپنی آواز یا گلے کا سر برقرار رکھنے کے لیے ہی شاید اس نے پان کھایا ہو گا۔ جس کی لالی ابھی تک اس کے ہونٹوں اور دانتوں پر موجود تھی ----- اپنے سامنے ہارمونیم رکھے وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر قوالی کی دھن بجا رہی تھی جب کہ اس کے دونوں پہلوؤں میں موجود دوہرے بدن کی میراثنیں جن میں سے ایک کے سامنے ڈھولک رکھی تھی اور دوسری نے ہاتھوں میں تاشے پکڑ رکھے تھے بڑی تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

تینوں گلے کو اچھی خاصی مشقت میں ڈال کر گا رہی تھیں۔ جب کہ ان کی چوتھی ساتھی جو شاید اس گروپ کی انچارج تھی اپنے سامنے ملیشیا کپڑے کا بنا ایک تھیلا رکھے ندیدے بچوں کی طرح اس میں پیر صاحب کے ساتھ دھرے ایک ایک دو دو روپے کے نوٹ ڈالتی جاتی تھی -----

کبھی کبھی جب اسے احساس ہوتا کہ اس کی پارٹی والوں کی آوازیں مدھم پڑنے لگی ہیں تو ان کا حوصلہ بڑھانے یا پھر جوش دلانے کے لیے ایک آدھ بے سری تان لگا دیتی-----

یہ تان باقی تینوں پر تازیانے کا کام کرتی اور وہ زیادہ جوش و خروش سے گانے لگتیں۔

کمرے میں اس سانولے رنگ کی میراثن کے علاوہ بھی محلے کی دس بارہ نوجوان لڑکیاں موجود تھیں۔ لیکن خدا جانے میری نظریں بار بار اس کے سراپے پر کیوں گڑ کر رہ جاتی تھیں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔

کمرے کی چھت میں اٹکے سالخوردہ لکڑی کے بالے سے لٹکتا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ عام حالات میں اس کے بیرنگوں کی آواز گلی کے باہر سنائی دیا کرتی تھی آج تو اس کے اطوار ہی اور دکھائی دے رہے تھے۔

لیکن-----

پنکھے کی چیں چیں کرتی احتجاجی آواز میں میراثنوں کی قوالی میں یا تو دب جاتی تھیں یا پھر ردھم کا حصہ بن گئی تھیں۔

سفید رنگ کی موتیے کی قمیص کے نیچے اس نے کوئی رنگ دار بنیان پہن رکھی تھی اور جب وہ پرانے سے ہارمونیم کو جس کے آدھے سر مسلسل بجانے سے گھسے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور شاید ہوا بھی بھرنے والی تھی زور زور سے بجاتی تو اس کے بائیں ہاتھ کی حرکت سے اس کا سارا جسم بھی ہلنے لگتا۔

یہ منظر میرے بدن پر لرزہ طاری کر دیتا۔

میں نے اگلے ہی روز دبئی میوزک سنٹر والے باؤ امین کے گھر پڑوسی ملک سے آنے والی تازہ بلیو فلم دیکھی تھی اس کی ہیروئن یقیناً یہی سانولے رنگ کی میراثن ہو گی

فی الوقت مجھے دونوں میں کچھ فرق بجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا-----

خدا جانے کسی نادیدہ قوت نے میرے ہاتھوں کو اپنی جگہ سے جنبش دی اور

سانولے رنگ والی میراثن کے گریبان سے نظریں ہٹائے بغیر میں نے اپنے دونوں جوتے اتار دیے۔

دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی گڈی سائیں کے منحوس ہاتھوں کو جعلی بوسہ دیا اور دیبو پہلوان کے نزدیک آلتی پالتی مار کر دری پر بیٹھ گیا۔

چیختی چنگھاڑتی میراثنوں کو لوگ عموماً ایک ایک دو دو روپے والے نوٹ گڈی سائیں کے ہاتھ لگوا کر دیتے تھے۔ میں نے ایک لمحے کو اف کیے بغیر اپنی جب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر گڈی سائیں کی طرف جھکتے ہوئے بڑھا۔

گڈی سائیں نے ایک لمحے کے لیے اپنی پوری آنکھیں کھول کر میرے ہاتھ میں چھپے نوٹ کا جائزہ لیا اور میرے دونوں ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ---- میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اپنا رخ بدلا اور دس روپے کا نوٹ ادھیڑ عمر کی موٹی سی میراثن کے سامنے پھیلے ملیشیا رنگ کے میلے کپڑے پر رکھنے کی بجائے سانولے رنگ کی میراثن کے سامنے دھرے ہارمونیم پر رکھ دیا۔

دس کا نوٹ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک پہلے سے بھی دوچند ہو گئی۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔

ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر جم گئی۔

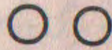
حال نی میرا پیا گھر آیا

کی تکرار کرتے ہوئے اس نے بایاں ہاتھ ہارمونیم سے الگ کیا اور برق رفتاری سے نوٹ اٹھا کر اپنے گریبان میں اڑس لیا ---- نوٹ کو اپنے گریبان تک منتقل کرنے کے لیے وہ قدرے آگے کی سمت جھکی اور میرے ذہن میں باؤ امین کے گھر اگلے روز

دیکھی ہوئی ساری فلم چل گئی ----

اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں۔ جیسے میرا دوران خون اچانک بہت تیز ہو گیا ہو اور جیسے میری شریانوں میں تپش رینگنے لگی ہو ----

اس کی جہاندیدہ نظروں نے شاید میرے اندر اٹھتے اس طوفان کا نظارہ کر لیا تھا۔ اپنی گردن کو ہلکا سا خم دے کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ اپنے کام میں جت گئی۔



میں تو شاید پتھر کا بت بن گیا تھا۔

لیکن ----

اچانک ہی دروازے سے والد صاحب کی کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"حنیف"

انہوں نے اتنی زور سے کہا کہ بے اختیار وہاں موجود تمام لوگوں کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔

میں کھسیانا سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

شاید سانولی رنگت والی میراثن کو میرے والد صاحب کی یہ "مداخلت بے جا" پسند نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس کی سیاہ رنگ والی گہری آنکھوں میں ہلکا سا احتجاج دیکھ لیا تھا۔

دروازے تک ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ---- پھر میں اپنے جوتے پہن کر بادل نخواستہ اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف گھوم گیا۔

"کیا کر رہے تھے یہاں؟"

والد صاحب نے میری پشت پر اپنی زہریلی آواز کا کوڑا برسایا۔

"جھک مار رہا تھا"-----

میں نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا۔

"کبھی تو ڈھنگ سے بول لیا کرو----- چار پیسے کیا کمانے لگے تمہارا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے"-----

والد صاحب نے احتجاج کیا۔

"اباجی----- دو گھڑی قوالی سننے کو رک گیا تھا----- اور کیا کر رہا تھا"-----

میں نے اپنا جواب مکمل کیا۔

"لاحول ولا قوۃ" ابے گدھے کہیں کے----- ویٹو کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے----- تجھے کیا ہو گیا"-----

انہوں نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

میں سانولے رنگ اور گہری سیاہ آنکھوں والی میراثن کا سراپا آنکھوں میں سجائے چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

"خدا جانے ان لوگوں نے کیا تماشا لگا رکھا ہے یہاں"-----

والد صاحب پھر بڑبڑائے۔

"اباجی----- ہمیں دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا کیا حق حاصل ہے"-----

میں نے والد صاحب ہی کے انداز میں پہلوان کی وکالت کر دی

"اچھا----- اب تم مجھے اخلاقیات پڑھاؤ گے-----

والد صاحب نے حسب معمول اگلے لیکچر کی تمہید باندھی اور پھر بولتے چلے گئے۔

والد صاحب کے خطاب اور میراثنوں کی قوالی کا خاتمہ ایک ساتھ ہوا تھا کیونکہ اب نیچے سے صرف لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ

گیا-----

"کہیں بلیو فلم کی ہیروئن چلی تو نہیں گئی"-----

میں نے سوچا۔

اور-----

دوسرے ہی لمحے بظاہر یہ تاثر دینے کے انداز میں کہ میں حسب سابق والد صاحب قبلہ کے لیکچر سے بور ہو کر بطور احتجاج باہر جا رہا ہوں سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔

"جہنم میں جا----- الو کے پٹھے۔ ابھی تجھے میری باتوں کی سمجھ نہیں آئے گی"-----

والد صاحب کی آواز مجھے اپنے تعاقب میں سنائی دی۔

میں ایک مرتبہ پھر آخری سیڑھی پر اس طرح کھڑا تھا کہ دائیں ہاتھ کھلے دروازے سے صرف میراثنیں مجھے اور میں ان کو دیکھ سکتا تھا-----

میراثنیں اپنی دوکان بڑھا رہی تھیں-----

ادھیڑ عمر اور دوہرے بدن والی میراثن جس نے نوٹ اکٹھے کیے تھے اب ملیشیا رنگ کے اس غلاف میں ہار مونیم باندھ رہی تھی۔ بلیو فلم کی ہیروئن اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کا دوپٹہ ابھی تک زمین پر دھرا تھا اب وہ جھک کر اٹھا رہی تھی۔ عین ان لمحات میں پھر ہماری نظروں کا ٹکراؤ ہوا۔

مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔

دوپٹہ اٹھا کر اس نے لاپرواہی سے اپنے شانوں پر پھیلایا اور میری طرف کنکھیوں سے دیکھتی تن کر کھڑی ہو گئی۔

اس کا مکمل سراپا میرے سامنے تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سانچے میں ڈھلی ہو۔ پاؤں کی ایڑیوں سے سر کے بالوں تک اس کا سارا بدن کسی سنگ تراش کا شاہکار یا پھر کسی آرٹسٹ کا کمال فن دکھائی دے رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے فائن آرٹس کے کسی ذہین طالب علم نے مقابلے میں رکھنے کے لیے کوئی پینٹنگ بنائی ہو۔

مجھے اپنے پچھواڑ میں موجود حویلی دھیان سنگھ کی دیواروں میں گڑی وہ تصویریں یاد آگئیں جو شاید کسی مہاراجا نے بطور خاص اپنے محل کی دیواروں پر کندہ کروائی تھیں۔ جیسے "نرت" "بھاؤ" ان تصویری "نرتکیوں" میں دکھائی دیتے تھے---- اسی طرح سانولے رنگ کی وہ میراثن بھی 'مینی ایچر' کا شاہکار بنی کھڑی تھی۔

کسی سحر زدہ معمول کی طرح میں آخری سیڑھی اتر کر دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

دوہرے بدن والی موٹی میراثن گڈی سائیں کے سامنے دونوں ہاتھ باندھے شاید اسی سے اذن رخصت لے رہی تھی----

"چل پتر نوری ----"

اس نے اپنے بدن سے لٹکے گوشت کو سلیقے سے گھما کر سانولی رنگت والی بلیو فلم کی ہیروئن سے کہا۔

جس کا نام نوری تھا----

لیکن----

جو "نوری" سے زیادہ "ناری" دکھائی دے رہی تھی۔

اس کی گہری سیاہ آنکھوں اور جامنی رنگت نے میری تن بدن میں جو آتش بھڑکائی تھی اس سے بالآخر مجھے راکھ کر کے ہی چھوڑا----

نوری نے سراث البرٹی کی کنیز خاص کی طرح گڈی سائیں کو سارے شاہانہ آداب بجالاتے ہوئے کمر کو خم دے کر سلام کیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھایا جس کے بالکل سامنے میں پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ نوری کے پہلو میں بیٹھنے والی چھکیلے بدن کی دوسری میراثن نے اپنے ہاتھوں میں اپنی اور اس کی جوتیاں پکڑ رکھی تھیں۔ شاید وہ ابھی تک ان جوتیوں پر ہی براجمان رہی تھی۔

سلیم شاہی نقلی تلے والا کھوسہ اس نے نوری کے سامنے پھینکا جس نے میری طرف مکمل مسکراہٹ اچھالتے ہوئے انہیں اپنے پاؤں میں اڑس لیا اور ایک طرف خم کھاتے ہوئے میرے نزدیک کھڑی ہو گئی۔

وہ میرے اتنا قریب تھی کہ اس کے بدن کی سنولاہٹ سے مجھے اپنا وجود دہکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے جسم سے لپٹی کوئی مست سی خوشبو میرے مشام جان کو معطر کرنے لگی تھی۔ تینوں موٹی میراثنیں اس کے تعاقب میں باہر آرہی تھیں۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ چاروں آگے بڑھ گئیں اور اب ان تین سیڑھیوں سے اتر رہی تھیں جو گلی اور مکان میں رابطہ رکھے ہوئے تھیں۔

گلی میں اترنے کے بعد نوری نے میری طرف گردن کو خم دے کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھ پر اسم اعظم پھونک دیا ہو۔

میں بے اختیار اس کے تعاقب میں چلنے لگا----



شاید میرا ٹارگٹ نوری میراثن کا آستانہ تھا----

میں ایک مرتبہ اس کا گھر دیکھنا چاہتا تھا۔ ہم چونکہ اندرون شہر کے رہنے والے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ہمارے نزدیکی کسی محلے میں رہتی ہو گی----

گلی میں پاؤں رکھتے ہی میں عالم ہوش و حواس میں واپس لوٹ آیا تھا۔ میں جانتا تھا

یہاں کی دیواروں کے کان ہی نہیں آنکھیں بھی ہوتی ہیں جو دور دور تک جھانک لیتی ہیں۔

نوری نے چلتے چلتے ایک مرتبہ میری طرف دیکھا اور مسکرا کر گردن سیدھی کر لی۔

میرے دل میں تو کیوپڈ مہاراج نے بھال اتار دیا تھا۔

لیکن -----

نوری کی حرکات نے بھی مجھے خاصا خوش فہم بنا دیا۔ اس نے گلی کے خاتمے پر اپنے ہمراہ چلنے والی دوہرے بدن کی میراثن کے ہاتھ میں پکڑی خالی چادر کو اپنے اردگرد آہنی حصار کی طرح تان لیا تھا اور اب ماحول سے بظاہر لاتعلق ان کے ساتھ ہنستی باتیں کرتی جا رہی تھی۔

یہ گلی بازار میں کھلتی تھی -----

میرا دل اچانک ہی کسی انجانے خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔ یوں لگا جیسے میں بہت سی نظروں میں آگیا ہوں۔ دراصل یہ میرا احساس جرم تھا یا پھر احساس ندامت جس نے مجھے خوفزدہ کیا۔

لیکن -----

میں بھی اتنی جلدی ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔

باؤ امین کے گھر دیکھی ہوئی بلیو فلم میرے دل و دماغ میں مسلسل چل رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے نوری کا گریبان کھلا پڑا تھا اور اس کے چہرے پر موجود سنوارہٹ ایک نشہ بن کر میرے رگ و پے میں اترنے لگی تھی۔

میں پریشان ہو رہا تھا کہ بازار میں قدم رکھتے ہی درجنوں شناسا نظروں کے حصار میں جکڑا جاؤں گا اور ان میں سے کوئی نہ کوئی میری اس حرکت کو نوٹ کر لے گا کہ اچانک قدرت کو جیسے میری حالت پر رحم آگیا۔

سامنے سے آنے والے ایک بزرگ کو دیکھ کر وہ سب اپنی جگہ رک گئیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ضرور اس بزرگ کا ان سے کوئی گہرا تعلق ہے۔ میں ہمت کر کے ان کے اتنا قریب ہو گیا کہ ان کی گفتگو سن لی۔

"ابا جی ----- شام تک آجانا"

مجھے نوری کی آواز سنائی دی۔ ----- تب میں یہ اندازہ نہ کر سکا کہ اس نے یہ فقرہ یقیناً مجھے سنانے کے لیے ذرا اونچی آواز میں کہا تھا تاکہ میرے اگلے کام میں آسانی پیدا کر سکے -----

اس بزرگ کا چہرہ مجھے شناسا دکھائی دیا۔

درمیانے وجود اور پکے رنگ والے اس ساٹھ پینسٹھ سالہ بزرگ کے چہرے پر مونچھیں بڑے سلیقے سے سجی ہوئی تھیں مجھے یاد آگیا اسے میں نے متعدد مرتبہ بشیرے نائی کی دکان کے سامنے بابو بینڈ والوں کے دفتر میں آتے جاتے دیکھا تھا۔

میرے سینے سے ایک لمبی سانس برآمد ہوئی اور میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ فی الوقت میں نے اپنی سٹریٹجی تبدیل کر لی تھی۔ اب مجھے نوری کے والد صاحب پر نظر رکھنی تھی۔ میں لاتعلقی کے انداز میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی موجودگی کا جواز پیدا کرنے کے لیے میں نے وہاں کھڑے ریڑھی والے سے فالسے خریدے اور کھانے لگا۔

یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر بشیرے کی دکان تھی۔ فالسے کھاتا میں سیدھا وہیں چلا گیا۔ بشیرے کے شاگرد گاہکوں کی حجامت بنا رہے تھے اور وہ حسب معمول دکان کے باہر والے تھڑے پر دھرے موڑھے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

"سنا مولوی باؤ ----- ہو گئی ملاقات گڈی سائیں سے" -----

اس نے اپنی عادت کے مطابق مجھے کریدنا چاہا۔

میں ذہنی طور پر تیار تھا۔

ہاں یار بشیرے ----- مجھے تو کوئی پہنچی ہوئی ہستی لگتی ہے"

میں نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا ----- اوئے باؤ حنیف یار تیرا دماغ تو ٹھیک ہے ناں" -----

اس کے لیے میرا جواب بالکل خلاف توقع تھا کیونکہ اس جواب کے بعد اس کے پاس تبصرے کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔

"دیکھ یار بشیرے ----- تو سارا دن غلط لوگوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ ہم بھی کوئی صوفی نہیں میں خواہ مخواہ کسی اللہ والے پر شک کرنا ٹھیک بات نہیں" -----

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ دیا۔

"بھئی آخر مولوی شریف صاحب کے صاحبزادے ہو۔ کبھی نہ کبھی تو تمہارے اندر نیکی کے جراثیم پیدا ہونے ہی تھے" -----

بشیرے نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"جو تیری مرضی سمجھ لے" -----

میں نے بزرگ پر نظریں جمائے ہوئے کہا جو اب انہیں چھوڑ کر اس طرف آرہا تھا۔ پھر میری توقع کے عین مطابق وہ "بابو بینڈ" کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ جہاں کوئی کلانٹ ماسٹر شاید اپنے شاگردوں کو ایک نئے پنجابی گانے کی ریہرسل کروا رہا تھا۔



میں بابو بینڈ والوں کی دکان کے سامنے لگی پٹھوروں کی دکان پر رکا اور وہاں کھڑے ہو کر پٹھورے کھانے لگا۔

دو پٹھورے کھانے میں جان بوجھ کر میں نے پندرہ بیس منٹ لگا دئے اور جیسے ہی

دکاندار کے مسلسل احتجاج پر خالی پلیٹ اس کو واپس تھمائی عین ان لمحات میں مجھے بابو بینڈ والوں کے دفتر کی سیڑھیاں اترتا وہی بزرگ چہرہ دکھائی دے گیا۔

میں نے ایک لمحے کا توقف کئے بغیر اپنے منصوبے کے اگلے حصے پر عمل شروع کر دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرح اس کے آگے آگے چلنے لگا کہ پیچھے آتے ہوئے وہ میری نظروں میں بھی رہے اور بظاہر یہی دکھائی دے کہ میں نہیں بلکہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔

اس آنکھ مچولی کا خاتمہ بالآخر احاطہ بیلی رام پر ہوا۔ احاطہ بیلی رام ہمارے شہر کا مشہور محلہ تھا یہاں قریباً تمام "آرٹسٹ" ہی رہا کرتے تھے۔ بازار حسن سے ملحقہ اس احاطے سے متعلق نزدیک دور بڑی پر اسرار لیکن دلفریب داستانیں مشہور تھیں۔ جب سے حکومت نے بازار حسن سے جسم فروش کا دھندہ بزور ختم کروایا تھا اور گانے بجانے والوں کی کم بختی آئی تھی اس کے بعد سے یہ احاطہ خاصا "پروگریسو" ہو گیا تھا۔

یہاں کے بیشتر مکین طوائفوں کے پیچھے "سفردئی" (ساز بجانا) کہا کرتے تھے۔ کوئی ہارمونیم بجاتا تھا کوئی طبلہ' سارنگی اور ڈھولک وغیرہ۔ یہ لوگ صدیوں سے اسی دھندے سے وابستہ تھے اور ان کی آمدنی کا ذریعہ بھی یہی تھا ----- اپنا فن وہ نسل در نسل اپنی اولادوں کو منتقل کرتے آئے تھے۔

ان میں سے جو خوش قسمت ہوئے وہ "ریڈیو ٹی وی آرٹسٹ" بن جاتے۔ یہ لوگ اپنی برادری میں ذرا اونچی کلاس میں شمار ہوتے تھے -----

اس برادری میں دوسری اہم کلاس ان نوجوان سازندوں کی تھی جو میوزک ڈائریکٹروں کے گروپس میں شامل تھے یا پھر وہ جنھوں نے اب اپنے "میوزک گروپس" بنا رکھے تھے۔

ان میوزک گروپوں میں بازار کی دو تین عورتوں کو ضرور رکھا جاتا تھا۔ جن کا گانا تو

شاید اتنی توجہ سے نہ سنا جاتا ہو، لیکن گانے پر وہ جو رقص پیش کرتی تھیں اس پر اپنی خاصی "داد" مل جایا کرتی تھی۔

جب سے بازار حسن زیر عتاب آیا تھا تب سے "استاد لوگوں" پر بھی بڑی سختی آگئی تھی۔ وہ سال ہا سال سے یہی دھندہ کرتے آئے تھے اور متبادل روزگار حاصل کرنا ان کے لیے کار دارد ہی نہیں باعث ننگ بھی تھا کیونکہ ان کے خاندانوں کی روایت میں رہی تھی۔

جب بازار شباب پر تھا تو ان کا روٹی پانی کا دھندہ بھی ملتا رہتا تھا---- اب پولیس اور انتظامیہ کی دہشت گردی نے کوٹھے اجاڑ دیے تھے۔ بازار سنسان پڑا تھا۔ ہفتے میں بمشکل دو تین دن دھندے کی اجازت ملتی تھی وہ بھی اتنی زیادہ پابندیوں کے ساتھ کہ عام تماش بین اس طرف پھٹکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پولیس والوں کا جب جی چاہتا اپنا "ماہانہ" بڑھانے کے لیے پریشر بڑھا دیتے۔ رات کے پہلے پہر ہی اچانک پولیس والے بازار پر ہلا بولتے اور کوٹھوں پر موجود "شرفا" کو ڈنڈے مارتے ہوئے تھانے لے جاتے-----

اگلے روز بازار کے خلیفہ لوگ ایک ایک کوٹھے کا دورہ کر کے روتی، منہ بسورتی اور گردش حالات کی ماری ہوئی طوائفوں کو حالات کی نزاکت کا احساس دلا کر ان سے "لقائے کا ماہانہ" بڑھانے کے لیے منت سماجت کر کے معمول سے زائد نذرانہ طوائفوں کی بد دعاؤں کے ساتھ وصول کر کے مقامی ایس ایچ او کی خدمت میں پیش کرتے اور چند ہفتے کی مزید مہلت مل جاتی-----

یہ سلسلہ ایک عرصے سے جاری تھا اور اب تو معمول کی بات بن کر رہ گئی تھی-----

○ ○

جس مکان کے دروازے سے وہ بزرگ اندر داخل ہوئے اس کے ایک کونے میں لکڑی کی ایک نیم پلیٹ لگی تھی جس پر نجانے کب کس نے لکھا تھا۔

"استاد رنگ خاں ریڈیو۔ ٹی وی آرٹسٹ"

امتداد زمانہ کے ہاتھوں یہ لکھائی ابھی تک محفوظ تھی یہ الگ بات ہے کہ موسمی تغیر و تبدل نے اس کی دھجیاں اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی---- تو یہ استاد رنگی خان کا گھر تھا-----

اور-----

نوری اس مشہور زمانہ کلاسیکل گلوکار کی صاحبزادی تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ عام میراثیوں کی طرح اس کے گانے کا انداز بھیک مانگنے والا نہیں تھا اور وہ اپنی گائیکی میں بھی منفرد دکھائی دے رہی تھی۔

استاد صاحب کے نام کی تختی پر نام پڑھتے ہی میرے ذہن میں فوراً یہ بات سما گئی کہ میں تو اچھا بھلا گلوکار بن سکتا ہوں-----

مجھے تو اب یاد آیا کہ گلی محلے کی شادیوں میں لوگ مجھ سے محمد رفیع کے گانے کی فرمائش کر کے سنا کرتے تھے اور میں پیتل یا لوہے کی تھال میز پر رکھ کر اسے ہاتھوں سے بجاتے ہوئے انہیں گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ گانے سنایا کرتا تھا---- "لو بھئی باؤ حنیف ----- فوراً استاد صاحب کی شاگردی اختیار کر لو---- دیوی درشن بھی ہوتے رہیں گے اور ونجاروں کا پھیرا بھی لگتا رہے گا" ---- میرے گمراہ ذہن نے فوراً ہی نوری تک پہنچنے کا نیا راستہ تلاش کر لیا-----

ساری رات میں کروٹیں بدلتا رہا---- یوں لگا جیسے میں اپنی عمر بھر کی نیند احاطہ بیلی رام میں چھوڑ آیا ہوں-----

مجھے بہر صورت نوری تک پہنچنا تھا۔ باؤ امین کے گھر دیکھی ہوئی بلیو فلم کی ہیروئن کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر گزرتا---- کچھ بھی-----

میرا دل جیسے میرے وجود سے نکلا چلا جاتا تھا اور اسے سنبھالے رکھنا ہی اب میرے لیے کار دار تھا۔ ایک ہی سوال رہ رہ کر مجھے بے چین کر رہا تھا کہ استاد رنگی خان تک رسائی کس طرح حاصل کروں؟

بالآخر جیسے گوہر مقصود میرے ہاتھ لگ گیا۔ مجھے فوراً اپنا چپڑاسی ولی یاد آگیا۔ جس کے متعلق سب جانتے تھے کہ اس کا تعلق ایسے ہی کسی علاقے اور خاندان سے ہے۔

عام حالات میں شاید میں اسے کبھی منہ لگانا بھی پسند کرتا اس روز بطور خاص جب میں اس سے چائے کا ہاف سیٹ منگوانے کے بعد دس روپے میں سے باقی ساری رقم اسے بطور ٹپ رکھ لینے کو کہا تو ایک مرتبہ تو ولی نے چونک کر میری طرف غور سے دیکھا کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی-----

لیکن-----

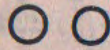
جب میں نے دوبارہ اسے باقی پیسے تم رکھ لو یار سائیں' کہا تو حیرت اور خوشی کے

ملے جلے جذبات سے اس نے میرے حق میں بڑا طویل کلمہ خیر کہا تھا----

دوپہر کو حسب معمول دوسروں کی طرح میں نے بھی ولی سے نان چھولے منگوائے اور اس مرتبہ پھر تین چار روپے اس کو ٹپ کر دیے-----

گو کہ دل کو کسی پل قرار نہ تھا اور میں اٹھ کر نوری تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن میرے اندر کوئی طاقت ضروری تھی جس نے مجھے بے قابو نہیں ہونے دیا اور میں خود کو بار بار ایک ہی بات کہہ کر مطمئن کر رہا تھا کہ باؤ حنیف اگر ٹھنڈی کر کے کھاؤ گے تو سکھی رہو گے گرم گرم کھانے سے کہیں زبان پر چھالے ہی نہ پڑ جائیں"-----

تین روز میں نے ولی پر محنت کی اور چوتھے روز اسے گھر آنے کا کہہ دیا۔



ولی کو میرے گھر کا علم تھا۔

چھٹی کا دن تھا وہ صبح سات بجے ہی میرے گھر پہنچ گیا۔ مجھے اس نے نیند سے بیدار کیا اور تھوڑی دیر بعد ہم بازار میں اکٹھے ناشتہ کر رہے تھے---- ولی کے لیے یہ سب کچھ کسی کرشمے سے کم نہیں تھا۔

اسے کبھی کبھی میری ذہنی حالت مشکوک لگتی تو یہ الگ بات کہ بے چارہ ڈر کے مارے اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے میری طرف سے کی جانے والی بے پناہ عزت پہلے تو حیران کن تھی اور پریشان کن ہو رہی تھی-----

"دیکھو یار ولی محمد---- چند روز پہلے تک میں بھی تمہیں دفتر کا عام سا چپڑاسی سمجھتا تھا---- لیکن اب نہیں---- جب سے مجھے علم ہوا ہے کہ تم تو استاد صابر خان مرحوم کے بیٹے ہو میرے دل میں تمہارے لیے بے پناہ عزت پیدا ہو گئی ہے"-----

میں نے بالآخر اس کو پٹڑی پر ڈال دیا۔

"سر جی---- آپ.....؟"

اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں ولی محمد یار میں تمہیں کیا بتاؤں ---- میرے لیے تو خود پر قابو رکھنا اب ممکن نہیں رہا ---- تمہیں شاید میں نے بتایا نہیں کہ مجھے بچپن ہی سے کلاسیکل موسیقی سے بے حد شوق ہے۔ بس کیا کروں یار ---- "کوڑ" لوگوں میں رہتا ہوں انہیں اس کی قدر ہے ---- کاش تمہارے والد صاحب زندہ ہوتے تو ان کی شاگردی کر لیتا ---- میں تو یار بس استاد لوگوں کے گانے کی نقل اتار کر ہی دل بہلا لیا کرتا تھا لیکن چند روز پہلے میں نے ریڈیو سے استاد خان کی گائی ہوئی "چندر کونس" سنی ہے۔ یار ولی محمد کیا بتاؤں ---- تب سے میرے دل پر کیا گزر رہی ہے ---- یار میں زندگی بھر تیرا احسان مند رہوں گا جس طرح بھی ممکن ہے مجھے رنگی خان صاحب کا شاگرد کروا دے" ---- میں نے بالاخر اپنا بڑا مضبوط مہرہ آگے بڑھا دیا۔

"باؤ جی ---- آپ مذاق تو نہیں کر رہے" ----

ولی محمد یار کاش یہ مذاق ہی ہوتا ---- لیکن تجھے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں رہی" ----

یہ کہتے ہوئے خدا جانے کیسے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ولی محمد تو جیسے تڑپ اٹھا۔

"باؤ جی ---- آپ مطمئن رہیں انشاء اللہ میں آپ کا شوق ضرور پورا کروں گا۔ گانے کا عشق واقعی بڑا برا عشق ہے باؤ جی ---- ہمیں دیکھ لیں۔ ساری زندگی ہمارے باپ نے طبلہ بجایا ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کا نام جانتا ہے۔ اور اس کی اولاد آج دفتروں میں چپڑاسی بنی ہوئی ہے ---- لیکن اپنے جدی پشتی فن سے منہ نہیں موڑا ---- اپنا خون جگر دے کر اس کی آبیاری کر رہے ہیں ----

وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا بالاخر مطلب کی بات پر آگیا۔

"باؤ جی ---- استاد رنگی خان معمولی آدمی نہیں ---- "تلونڈی گھرانے" کے مانے ہوئے استاد ہیں ---- میری ایک رشتے کی بہن ان کے گھرانے میں بیاہی ہوئی ہے ---- ہمارا رشتہ دار ہی ہے ---- میرے والد نے بہت عرصہ ان کے ساتھ سنگت کی تھی ---- دونوں نے بڑے بڑے "میدان" اکٹھے گائے اور بجائے ہیں ---- میری بات وہ نہیں موڑ سکتے ----

یہ کہہ کر اس نے بڑا ہی گھٹیا قسم کا کوئی سگریٹ سلگایا اور اس کا دھواں بڑی بے تکلفی سے میرے منہ پر دے مارا۔

عام حالات میں اگر وہ ایسی حرکت کرتا تو میں اس کا ٹینٹوا دبا دیتا ----

لیکن ----

فی الوقت میرے لیے سوائے خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

"آپ سمجھیں آپ کا کام ہو گیا ---- میں آج ہی ثریا سے بات کروں گا اور جمعرات کو آپ کی شاگردی کروا دیں گے" ----

اس نے بالاخر فیصلہ کن لہجے میں کہا تو میری جان میں جان آئی۔

اگلے روز جب وہ دفتر آیا تو سیدھا میری طرف ہی آیا ----

"باؤ جی مبارک ہو ---- آپ کا کام بن گیا ---- بڑی قسمت والے ہیں آپ جو استاد صاحب راضی ہو گئے۔ وہ تو ثریا کی مہربانی تھی ورنہ اتنے بڑے استاد کسی "عطائی" کو شاگرد نہیں بنایا کرتے۔" ----

اس نے میری کرسی کے نزدیک آکر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا ----

لیکن ----

اس کے ساتھ ساتھ یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ کہیں اس بات کا علم دفتر کے لوگوں کو نہ ہو جائے یار ولی محمد تیرا بہت شکریہ میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا ---- لیکن ذرا پردہ ہی رکھنا ---- تجھے تو علم ہے اپنے دفتر کے ماحول کا ---- "کوڑ لوگ ہیں ---- خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا"----

میں نے اس سے رازدارانہ لہجے میں درخواست کی۔

"میں سمجھتا ہوں باؤ جی۔ مولا کریم نے سب کو آپ کی طرح سر کا عشق نہیں بخشا۔ بدقسمت ہیں ---- ہیرے کی قدر جوہری ہی جان سکتا ہے میں نے اس کی مزید بک بک سے بچنے کے لیے اسے چائے لانے کے لیے بھیج دیا۔



جمعرات کو ابھی دو روز باقی تھے جب ولی محمد شام گئے میرے گھر آن دھمکا ----

"سر جی! میرے ساتھ چلیں ----

"خیریت"

میں نے جوتے سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں خیریت ہی ہے ---- وہ ثریا باجی آئی ہوئی ہے۔ جس نے آپ کا کام کروایا ہے ---- باؤ جی آپ تو جانتے ہی ہیں۔ اس فن میں ادب و آداب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ انہوں نے بات تو کر لی ہے۔ آپ ان کے بچوں کے لیے کچھ مٹھائی وغیرہ لے جائیں۔ بے چاری خوش ہو جائے گی ---- سر جی! ان لوگوں کی دعائیں ضرور لیا کریں۔ اور ان کی بد دعا سے ڈرتے رہیں"----

ولی محمد نے میری گردن پر چھری رکھ دی۔

میں بادل نخواستہ اس کے ساتھ نیچے بازار میں چلا آیا۔ دو کلو مٹھائی کا ڈبہ خریدا اور اس کے گھر پہنچ گئے' اس کا گھر احاطہ بیلی رام سے ملحقہ محلّہ قصائیاں میں تھا ---- ثریا

بیگم اپنے چھ بچوں سمیت وہاں فروکش تھی۔ گہرے سانولے رنگ کی اس عورت نما لڑکی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔ مسلسل پان کھانے سے اس کے دانتوں کا رنگ سرخی مائل سیاہ ہو رہا تھا اور ہونٹوں پر بھی لکیریں سی پڑنے لگی تھیں۔ اس کے بچوں نے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ لیکن کیا مجال جو ثریا بیگم کے کان پر جوں بھی رینگتی ہو ----

"باجی جی ---- یہ باؤ حنیف صاحب ہیں۔ ہمارے افسر ہیں ---- انہوں نے خان صاحب کی شاگردی کرنی ہے۔"----

اس نے ایک کباڑ خانے نما کمرے میں داخل ہو کر مجھے ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے میرا تعارف باجی ثریا سے کروایا ---- جو سامنے والی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔

"باؤ جی ---- یہ بھائی جان شریف خاں صاحب ہیں"----

سیاہ رنگت والے ایک تیندوے کا جو ثریا بیگم والی چارپائی کے دوسرے کونے پر بیٹھا تھا تعارف کرواتے ہوئے ولی محمد نے کہا۔

"باؤ جی ---- شریف خاں صاحب غضب کے ستار نواز ہیں ---- خاں صاحب امید علی خاں کے شاگرد ہیں ---- ان کے والد استاد موج خاں صاحب سارنگی بجایا کرتے تھے ---- ایک زمانہ جانتا ہے انہیں ---- بابا کیسے لوگ ہیں ----

ان کے نام کی دھوم تو سارے زمانے میں ہے"----

ولی محمد نے اسی تیندوے کا تعارف مکمل کروایا اور میرا تعارف اس سے اس انداز میں کروایا جیسے قصائی کو بکرے کی خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔

"جیتے رہو ---- میاں صاحبزادے کام تو مشکل ہے لیکن نیت اور لگن سے سیکھو گے تو ضرور کچھ پا جاؤ گے"----

شریف خاں صاحب نے مجھے ہاتھ اٹھا کر بشارت دی۔

"جیتے رہو"-----

ثریا بیگم نے اپنے گلے سے لپٹے ایک ننگ دھڑنگ بچے کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے لیے مٹھائی لائے ہیں"-----

ولی محمد نے میری طرف دیکھ کر آنکھ سے اشارہ کیا۔

میں نے دو کلو مٹھائی کا ڈبہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

ثریا بیگم کے ہاتھ پھیلے ہی رہ گئے ان کی بڑی لڑکی نے چیل کی طرح جھپٹ کر ڈبا اٹھایا اور وہیں کھول کر اس میں سے دو تین اچھے قسم کے پیس نکال لیے----- جس کے بعد وہاں طوفان بدتمیزی مچا کہ خدا کی پناہ-----

بمشکل پاؤ بھر مٹھائی باقی بچی جس میں سے برفی کا آدھا ٹکڑا میں نے شریف خاں صاحب کے اصرار پر اٹھا لیا۔

"سرجی----- خاں صاحب کو نذر کریں۔ استاد لوگ ہیں بابا----- گنی لوگ ہیں ان کی دعائیں بڑے کام آئیں گی-----

ولی محمد نے اگلا حملہ کیا اور میں لرز کر رہ گیا۔

بادل نخواستہ میں نے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور بڑے احترام سے ان کی "نذر" کر دیا۔ یہ آغاز تھا-----

مجھے تو بعد میں علم ہوا کہ "نذر نیاز" کا یہ سلسلہ "شاگرد" کے مرنے سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔

شریف خاں صاحب کی فرمائش پر میں نے انہیں ایک گانا سنا دیا----- بچوں نے تو میرے گانے پر الٹے سیدھے منہ بنائے لیکن شریف خاں صاحب نے کہا۔

"روح داری ہے"

"روح داری" ان کی خاص اور اصطلاح تھی۔ جس کا شاید مطلب یہی ہوتا تھا کہ بکرے کا گوشت مستقبل میں کھایا جا سکتا ہے-----

تھوڑی دیر تک شریف خاں صاحب کے والد مرحوم استاد موج خاں صاحب اور ولی محمد کے والد استاد صابر حسین مرحوم کی بے پناہ تعریفیں سننے کے بعد میں تین سو روپے کی قربانی دے کر واپس لوٹ گیا۔

ثریا بیگم نے مجھے کہا تھا۔

"باؤ جی----- جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہو گا"

اس فقرے کا مطلب مجھے باہر آنے پر ولی محمد نے سمجھایا۔

"سرجی! آپ کی استادی شاگردی میں نہیں جا رہے----- رنگی خاں صاحب جگت استاد ہیں۔ ایک زمانہ انہیں جانتا ہے----- جتنی زیادہ "نذر" کریں گے اتنی زیادہ عزت ہو گی، رسم شاگردی میں بڑے بڑے لوگ آئیں گے۔ بڑے بڑے استاد بیٹھیں گے جن کو الگ الگ کی "نذر" ضرور دینا----- ایسے موقعے زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں"-----

نوری کے عشق کی قیمت میری توقعات سے بڑھ کر زیادہ تھی۔

لیکن-----

مجھے بہر صورت یہ قیمت ادا کرنی تھی۔

باؤ امین کے گھر دیکھی، بلیو فلم نے میرے دل و دماغ میں اندھیر جو مچا رکھا تھا۔



جمعرات کو میں نے دھوبی سے دھلے ہوئے کپڑے زیب تن کئے اپنی تیاریاں مکمل کیں اور ولی محمد کے ساتھ احاطہ بیل رام پہنچ گیا-----

لکڑی کا سالخوردہ دروازہ بند تھا----- مجھے ڈر تھا کہ ولی محمد یا میں نے اسے زور سے بجایا تو دروازہ ٹوٹ کر اندر جا گرے گا۔ شاید ماضی میں کبھی یہاں "کال بیل" بھی لگائی گئی تھی ----- لیکن، یہ ان دنوں کی بات ہو گی جب استاد رنگی خان نے اپنے نام کی تختی لکھوا کر دروازے پر نصب کروائی تھی گھنٹی کے باہر والا سارا حصہ غائب تھا صرف دو ننگے تار اور ان سے لپٹے پیتل کے کلپ موجود تھے کہ کوئی انہیں ہاتھ لگائے اور موت کا مزہ چکھے۔

گلی میں موجود مکانات کے سامنے یا تو چارپائیاں دھری تھیں کسی گھر کے سامنے بکری بندھی تھی اور ایک چھوٹا سا کتا مسلسل بھونک رہا تھا---- چھوٹے چھوٹے ننگ دھڑنگ بچے گلی میں پلاسٹک کی گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ یہ گیند ان چارپائیوں پر دھری ریٹائرڈ میراثنوں میں سے جس کو لگتی وہ اپنے منہ سے سگریٹ یا حقے کی نالی الگ کر کے اپنی بے شمار مغلظات سے نواز دیتی۔

لیکن -----

بچوں کے لیے شاید یہ گالیاں بھی معمول کا حصہ تھا وہ گالیاں دینے والی بوڑھی عورت کو چڑانے کے انداز میں ہنسنے لگتے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

ولی محمد نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ شاید تیاریاں مکمل تھیں۔ دروازہ کھلتا چلا گیا اور دونوں پٹ کھلنے پر جس شکل پر میری نظر پڑی اس نے میری دل کی دھڑکنوں کو دو چند کر دیا۔

دوپٹے سے بے نیاز کالی شلوار اور سرخ قمیض میں لپٹی نوری ----- کسی سیاسی پارٹی کے جھنڈے کی طرح تن کر ہمارے سامنے کھڑی تھی ----- وہ ننگے پاؤں ہی کمرے سے اٹھ کر یہاں آگئی تھی۔ میری بے تاب نظریں اس کے چہرے سے پھسلتیں اس کے قدموں پر ٹک گئیں۔ شاید اس نے آج ہی اپنے ناخنوں کو نیل پالش سے رنگ دیا

تھا۔ گہرے سانولے رنگ کے پاؤں پر گہری سرخ رنگ کی نیل پالش عجیب بہار دکھا رہی تھی۔

میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک شناسا اور دلفریب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں جاگی اور اس کے سارے سراپے پر پھیل گئی۔

ہم دونوں نے پہلی ہی نظر میں ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا---- نوری آخر استاد رنگی خان کی بیٹی تھی ----- اسے فوراً سارے ڈرامے کی سمجھ آگئی۔ بڑی عجیب سی نظروں سے اس نے مجھے دیکھا۔ شاید میری طرح کے عاشق سے اس کا پالا زندگی میں پہلی مرتبہ پڑا ہو گا-----

"سلام بھئی ولیا-----"

اس نے ولی محمد کو پہچان کر اپنا ایک ہاتھ طوائفوں کے سے انداز سے اٹھا کر سلام کیا۔

جواب میں ولی محمد نے باقاعدہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے شانوں پر تھپکی دی۔

"خان صاحب ہیں ناں"-----

اس نے چھٹتے ہی کہا۔

"ہاں ----- شاید آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں"

اس نے اندر کمرے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

اس درمیان ایک لمحے کے لیے بھی اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کا گریبان کھلا ہے اور سر پر دوپٹہ بھی نہیں۔

"آیئے جی"-----

اس نے اپنے موتیوں ایسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پہلی مرتبہ سے مخاطب

کیاتو میرادل دھک سے رہ گیا۔

ہم چند قدم اس کے تعاقب میں چلنے کے بعد ایک غار نما کمرے میں داخل ہوئے۔

یہ کمرہ ہی شاید اس گھر کی کل کائنات تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں دھری لوہے کی بڑی سی پٹی پر دو مرمت طلب ہارمونیم اور ایک "سرمنڈل" رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ دیوار پر لگی پرچھتی پر پھولدار شیشے کے گلاس سجے اور گلدان سجے ہوئے تھے جب کہ دوسری طرف سٹیل اور نام چینی کی پلیٹیں دھری تھیں۔

ایک کونے میں لکڑی کے فریم والا سنگھار میز اپنی بے بسی پر ماتم کناں تھا۔ شاید اس کے سامنے دھرے "موڑھے" سے ہی نوری اٹھ کر گئی تھی کیونکہ وہاں دو نمبر کی نیل پالش سرخیاں کریم کی خالی ڈبیاں اور ایک پرانا ساتبت پاؤڈر کا ڈبہ دھرا تھا۔

استاد رنگی خاں اور اس کے ہمشکل دو اور بوڑھے کمرے کے آخری کونے میں زمین پر بچھی صف نما چٹائی پر براجمان تھے۔ چھت پر لگا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ لیکن اس کے پر شاید ٹیڑھے ہونے کے سبب اس کی ہوا یہاں موجود لوگوں کو کم اور برتنوں کو زیادہ لگ رہی تھی۔

"سلام علیکم استاد جی۔"

ولی محمد نے استاد رنگی خاں کے قدم ہندوؤں کی طرح چھوتے ہوئے کہا۔

میں نے اس سے زیادہ "نیاز مندی" کا مظاہرہ کیا تھا۔

"جیتے رہو ----- جیتے رہو"-----

استاد رنگی خاں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

نوری اس درمیان ماحول سے قطعی بے نیاز اس "موڑھے" پر بیٹھی اپنا سامان

آرائش و زیبائش سمیت کر سنگھار میز کی ایک دراز میں جس کا ہینڈل ٹوٹا ہوا تھا رکھ کر کھڑی ہو گئی اس نے لوہے کے ٹرنکوں پر دھرے کپڑوں کے ڈھیر میں سے ایک سفید رنگ کا دوپٹا اٹھایا اور اسے بڑی بے نیازی سے اپنے گلے میں رسے کی طرح ڈال لیا-----

"کیا نام ہے بیٹا تیرا۔"-----

رنگی خاں صاحب نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لینے کے بعد پوچھا

"جی ----- حنیف خاں-----"

"جیتے رہو حنیف خاں---- بڑی قسمت والے ہو جو یہاں تک پہنچ گئے۔ خاں صاحب کی شاگردی کے لیے ایک زمانہ ترستا ہے ---- تم تو بڑے قسمت والے ہو جو خان صاحب مان گئے ورنہ تو یہاں بڑے بڑے کاروں اور کوٹھیوں والے آئے اور چلے گئے"-----

وہاں موجود جو بوڑھے استادوں میں سے ایک نے خامہ فرسائی کی۔

"خاندانی بچہ لگتا ہے-----"

دوسرے نے حقے کی "نے" منہ سے الگ کئے بغیر مختصر سا تبصرہ کیا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے میری معاشی حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے حیلے۔ اس مرحلے پر ولی محمد نے میرا شاندار قسم کا تعارف کروا دیا۔ اس نے بتایا تھا کہ میں محکمہ مال" میں ایسی آسامی پر لگا ہوں جس کے لیے لوگ لاکھوں روپے رشوت دیتے ہیں اور انہیں وہ آسامی نہیں ملتی۔

ولی محمد نے بات سچی کی تھی ----- میں تو ڈرتے جھجکتے بھی روزانہ دو ڈھائی سو کما لیتا تھا اس سیٹ پر تو لوگوں نے روزانہ ہزاروں کمائے تھے۔

استاد صاحب کو مجھ سے بہتر امید ہو چلی تھی ----- انہوں نے ولی محمد کو حکم دیا کہ "اٹی مولی" لے آؤں -----

ولی محمد نے میری طرف دیکھا اور میں نے سو کا نوٹ اسے تھما دیا۔ تھوڑی دیر بعد بھی وہ ایک تھالی میں رنگین دھاگے (اٹی مولی) اور چینی رکھ کر لے آیا۔ استاد صاحب نے اس درمیان خدا جانے کیا خفیہ سگنل دیا کہ کمرے میں اچانک ہی تین چار مرد اور تین چار عورتیں آگئیں۔ خدا جانے یہ لوگ اسی موقعے کے منتظر تھے۔

وہ سب میرے گرد دائرہ باندھ کر بیٹھ گئے -----"

"اوئے ----- سائیں لوک کہاں گیا۔"

اچانک ہی استاد صاحب کو کچھ یاد آگیا۔

"یہیں تھا ----- جانے کہاں مرا رہتا ہے ----- جا بشیرے پتر تو اسے لے کر آ" ----- دوہرے بدن کی ایک میراثن نے جو نوری کے ساتھ دینو پہلوان کے گھر "چوکی بھرنے" آئی تھی۔ کسی آدمی نے کہا

یہ استاد رنگی خاں کی زوجہ محترمہ اور نوری کی والدہ محترمہ تھیں -----

بشیر بڑبڑاتا ہوا باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک "سائیں لوک" کے ساتھ واپس آگیا۔ یہ استاد صاحب کی واحد اولاد نرینہ تھی۔ شاید بے چارہ معذور تھا اس لیے اسے لمبا سا چوغہ پہنا کر گلے میں ایک تختی باندھ دی گئی جس پر اس کا نام اور گم ہونے کی صورت میں گھر پہنچانے کا ایڈریس لکھا تھا۔

نوری کی دو اور چھوٹی بہنیں تھیں -----

اس طرح استاد رنگی خان کی تین بیٹیاں اور ایک نیم پاگل بیٹا تھا ----- استاد صاحب کو اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی جس کا اظہار بعد میں ہوتا رہا۔ نوری کو اپنے باپ سے زیادہ اپنے بھائی سے پیار تھا۔ میں نے اندازہ کیا تھا کہ اسے یہاں موجود کسی شے

سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

لیکن -----

وہ اپنے بھائی "سائیں لوک" کو اپنے ساتھ بٹھا کر اپنے دوپٹے سے اس کے منہ سے نکلنے والی رال صاف کر رہی تھی۔

ولی محمد کے کہنے پر میں نے ڈرتے ڈرتے وہاں کچھ سنانے کی ہمت کی۔ بشیرے نے ہارمونیم اور ان بوڑھوں میں سے ایک نے طبلہ پکڑا تھا ----- میں نے ایک گانا سنا دیا ----- نہ میرا سر ہارمونیم سے مل رہا تھا نہ ہی میری "لے" قائم تھی۔ طبلہ اور ہارمونیم کچھ اور بجا رہے تھے اور میں کچھ اور سنا رہا تھا۔

لیکن -----

یہ بڑے کائیاں لوگ تھے ----- ہاتھ آئی "مایا" کو یوں تو جانے نہیں دیتے تھے۔

"واہ جی واہ ----- جیتے رہو باؤ جی -----"

سب سے پہلے ولی محمد نے کہا۔

"روح داری ہے ----- محنت کی تو سیکھ جائے گا۔"

ایک استاد نے رائے دی۔

"بیٹا! یہ تو "کرت ودیا" ہے۔ جتنا کرو گے۔ اتنا پالو گے"-----

استاد رنگی خاں نے کہا۔

اب باقاعدہ شاگردی شروع ہوئی۔ میں نے پہلے استاد صاحب کو اپنے گزشتہ ایک ہفتے کی ساری حرام کی کمائی نذر کر دی۔

استاد صاحب نے نوٹ گنے -----

ان کی گنی مونچھوں کے نیچے ایک مسکراہٹ جاگی اور انہوں نے چاہا کہ نوٹ اپنے "سلوکے" کی جیب میں رکھ لیں۔

لیکن -----

خدا جانے استانی نے ان کی طرف کس طرح دیکھا کہ بے اختیار انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس کے بعد استانی کے احکامات شروع ہوئے۔

"حنیف بیٹے ----- استادوں کو بھی نذر دو"-----

یہ پہلا حکم تھا جس کے بعد مجھے یہاں موجود قریباً تمام لوگوں میں سو سو کے نوٹ تقسیم کرنے پڑے۔ ان میں ولی محمد بھی شامل تھا کیونکہ وہ بھی "استادوں" کی آواز تھی۔

سب سے آخر میں استاد رنگی خاں نے نوری کو بلایا۔

"حنیف پتر----- دنیا میں میرا سب کچھ ہی نوری ہے ---- اللہ نے بیٹا دیا تو -----"

استاد صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"باؤ جی ----- نذر کریں"-----

ولی محمد نے کہا۔ استاد صاحب کا تو گلا ہی رندھ گیا تھا۔

"میں نے اپنی جیب میں موجود سو سو کے آخری دو نوٹ نکالے اور اپنے سامنے بیٹھی نوری کے سامنے قریباً دو زانو ہوتے ہوئے اس کی "نذر" کر دیے۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مسلسل ٹھہر گئی تھی۔

خدا جانے یہ طنز تھا-----؟

محبت تھی؟-----

تمسخر تھا؟

یا پھر میری بے بسی پر اس کا تبصرہ-----

اس نے پہلی مرتبہ بڑی گہری نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا اور حسب

روایت نوٹ اپنے گریبان میں اڑس لیے -----

"جا پتر چائے بنالا -----"

استاد رنگی خان نے اپنی دوسری بیٹی سے کہا جو ہنستی ہوئی باہر چلی گئی -----

"چل پتر بشیرے تانگہ نہیں جوتنا-----"

استاد صاحب نے پہلا حکم جاری کیا-----

جس کے بعد میدان استادنی نے سنبھال لیا جس نے کمرے میں آنے والے باقی تمام لوگوں کو بھی اشارے کنایے سے باہر نکال دیا' اب وہاں ثریا' نوری' ولی محمد' دونوں بوڑھے اور میں رہ گیا تھا-----

استاد رنگی خان نے میرے منہ سے چینی لگائی اور رنگین دھاگہ میرے ہاتھ میں باندھ کر گویا مجھے شاگردی کی سند عطا کر دی۔

"نوری پتر-----ذرا "الیمن" چھیڑ دے"

انہوں نے نوری سے کہا۔ جس نے اب ہارمونیم سنبھال لیا تھا۔

"لو بیٹا----- آج سے تمہاری تعلیم شروع ہے ----- اس گھر کو اپنا گھر سمجھو ----- جتنی محنت کرو گے اتنا پھل پا لو گے ----- بیٹا یہ گانا بڑی بے وفا شے ہے۔ کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بڑے بڑے استادوں کو ہر روز بڑے کڑے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے ----- بیٹا! دنیاوی تعلیم میں ایک مرتبہ ایم۔ اے کرنے والے کو ساری زندگی کے لیے ایم اے کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ----- استاد کتنا بھی بڑا ہو۔ اسے ہر "میدان" میں اپنی استادوں کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے ----- "ایمن" شام کا روگ ہے ----- "کلیان ٹھاٹھ کا سمپورن راگ" تم کل سے ایک کالی پتیلی ساتھ لایا کرو ----- جو میں کہوں لکھتے رہا کرو ----- زندگی میں کسی میدان میں مار نہیں کھاؤ گے ----- یاد رکھنا"-----

نوری کی انگلیاں اس درمیان مسلسل ہارمونیم کے سروں سے کھیلتی رہیں۔

"اچھا اب میرے پیچھے پیچھے کہو"-----

استاد صاحب نے کہا اور نوری نے بجانا شروع کیا۔

"نی۔ رے۔ گا۔ ما۔ دھا۔ نی۔ سا۔ رے

ما۔ نی۔ دھا۔ پا۔ ما۔ گا۔ رے۔ سا"

میں ان کی آواز سے اپنی بساط بھر کوشش کے ساتھ آواز ملاتا گیا۔

اپنا "کھرج" قائم کرو بچہ -----اگر "سا" صحیح ہو گیا تو سمجھو گانا آگیا"-----

ایک بوڑھے استاد نے کہا۔

"پہلا سر لگا نوری پتر-----"

استاد صاحب نے نوری سے کہا جس کی مسکراہٹ چھپائے نہ چھپتی تھی۔

نوری نے ایک سر دبایا اور استاد صاحب نے مجھے اس کے ساتھ آواز ملانے کا حکم دیا۔

چائے کی آمد تک میں آواز ہی ملاتا رہا-----

لیکن-----

ابھی شاید میرا "کھرج" قائم نہیں ہوا تھا۔

چائے آگئی ----- مٹھائی کا ڈبہ کھل گیا-----

بمشکل ابھی سب نے ایک ایک پیس ہی اٹھایا تھا جب استادنی نے بلی کی طرح جھپٹ کر ڈبا اٹھایا اور اسے بند کر کے سامنے پرچھتی پر رکھ دیا۔

"اچھا بھائی رنگی خاں جی ----- ہم نے یار آج ساز بھی سر کروانے تھے۔"-----

دونوں بوڑھے استادوں میں سے ایک نے کہا اور دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

سب نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ کچھ تو دھند چھٹی۔ مطلع اب قدرے

صاف ہوا تھا۔ "اچھا باؤ جی میں بھی چلتا ہوں ----- بلو کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا ----- چاچا جی کے ساتھ وقت طے کر لو ----- میرے خیال سے صبح یہاں سبق لے لیا کرو اور شام کو خاں صاحب کے ساتھ "بیٹھک" پر "ریاض" کر لیا کرو ----- کیوں جی خاں صاحب"-----

ولی محمد نے بھی اٹھنا چاہا۔ میلہ جو ختم ہو گیا تھا۔

"جیسے تجھے سہولت ہو بیٹا ----- شاگرد اپنی اولاد جیسے ہوتے ہیں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو"-----

رنگی خاں نے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے مونچھوں میں لپٹی مٹھائی کے ذرات صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ولی محمد ----- شکریہ یار تم چلو کل ملاقات ہو گی"

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اب یہاں میرے اور نوری کے علاوہ اور کوئی نہ رہے۔ یہ سارا "کھڑاک" میں نے نوری کے لیے تو پھیلایا تھا۔ مجھے کوئی "تان سین" نہیں بننا تھا ----- اگر قدرت نے مجھے کچھ آواز دے دی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ باتھ روم میں گنگنانے والا ہر شخص گلوکار بن سکتا ہے ----- یہ تو ایک راستہ تھا نوری تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ----- ابھی تو میں نے ایک ہی سیڑھی پھلانگی تھی۔ خدا جانے ابھی مجھے اس راہگزر پر اور کتنی دور تک جانا تھا-----

خدا جانے ابھی مجھے اور کتنے سوانگ بھرنے تھے۔

اور کیا کیا روپ اختیار کرنا تھا-----

کیا کیا ڈھنگ رچانا تھا-----

جامنی رنگت اور گہری سیاہ آنکھوں والی نوری کو پانے کے لیے ابھی مجھے کتنے اور دریا عبور کرنے تھے۔

میرے اور اس کے درمیان اب فاصلہ ہی کتنا رہ گیا تھا۔

صرف ایک ہارمونیم ہی تو ہم دونوں کے بیچ حائل تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ اپنی حرام کی کمائی کے بل بوتے پر میں اپنے اور اس کے درمیان موجود یہ معمولی سا پردہ بھی جلد ہی گرالوں گا۔

جس کے بعد باؤ امین کے گھر دیکھی بلیو فلم کی یہ ہیروئن میری جاگیر بن جائے گی

ہوس جب سوچ پر غلبہ پائے تو جذبات انسان کو گمراہیوں سے کن اور اندھیرے غاروں میں دھکیل دیا کرتے ہیں ----- تب مجھے اس تلخ سچائی کا ادراک نہیں تھا۔

تب میں یہ نہیں جانتا تھا کہ شہوانیت کی اندھیری وادیوں کی طرف کھلنے والے راستے انسان کو بدنامیوں اور سیاہ کاریوں کے کن کن بازاروں میں رسوا کرواتے ہیں

شام ڈھلے جب میں کوچہ بیلی رام کے اس گھر سے جس کے باہر استاد رنگی خاں ریڈیو ٹی وی آرٹسٹ کے نام کی سالخوردہ تختی لٹکی ہوئی تھی رخصت ہوا تو میری گردن اصیل مرغ کی طرح پھولی ہوئی تھی کہ میں "ایمن کلیان" کی ساری سرگم ایک ہی شام میں یاد کر آیا ہوں -----

اچھا یا برا میں نے سارا "پلٹا" کہہ لیا تھا۔

مجھے "ایمن کلیان" کی آروہی اور امروہی یاد ہو گئی تھی۔

لیکن -----

مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ صرف آروہی امروہی یاد کر لینے سے ----- راگ مکمل نہیں ہوا کرتے -----

اس کی تو "مینڈھ سودھ" کو سنوارتے ہی ساری زندگی گزر جاتی تھی اور راگ گانا نہیں آتا تھا-----

نوری کے آستانے تک پہنچ جانے کے نشے میں سرشار میں بازار میں پہنچا تو کچھ یار دوست مل گئے جو مجھے کافی دیر سے تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت کرید کرید کر مجھ سے میری مصروفیات کا سبب جاننے کی کوشش کی لیکن اب میں اتنا سیدھا بھی نہیں تھا۔ شام دیر گئے تک ہی بازار میں ان کے ساتھ ہی گلچھڑے اڑاتا رہا اور اندھیرا ڈھلے گھر پہنچے تو حسب سابق گھر کے دروازے کے باہر ہی والد صاحب نے دیر سے آنے پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ میرے کان پر کیا جوں رینگتی غصے سے چلاتے چلاتے ان کا گلہ بیٹھ گیا۔

"مولوی جی ----- جانے دو آج کل کا زمانہ ہمارے والا نہیں رہا ----- کوئی بات نہیں لڑکا کون سا بھاگا جا رہا ہے" -----

بالآخر دینو پہلوان نے ہی بڑے حساب کتاب سے والد صاحب کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

میں نے کاروائی ڈالنے کے لیے دو تین لقمے زہر مار کئے اور اوپر کوٹھے پر چلا گیا-----

میری عادت تھی بازار سے رات کو سونف والا پان لے آتا اور کھانا کھانے کے بعد سب سے اوپر والے کوٹھے پر بیٹھ کر محلے کے مکانات کی ایک دوسرے سے منسلک

چھتوں پر ہونے والے عشق و ہوس کے کھیل دیکھتا رہتا۔

میرے گھر کے باقی لوگ عموماً عشاء کی نماز پڑھ کر سو جایا کرتے تھے۔ آج بھی ویسا ہی ہوا۔ اس وقت رات کے قریباً دس بج رہے تھے اور میں زیر لب استاد رنگی خاں کا دیا ہوا ''ایمن کلیان'' کا متن گنگنا رہا تھا جب کسی کے بلی کی طرح دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنے کی آواز سنائی دی۔

گرمیوں کی وجہ سے پہلوان کے گھر والے بھی اوپر آجایا کرتے تھے۔ کیونکہ ''بے پردگی کے خوف سے میری والدہ' بہن اور والد صاحب کمرے میں سوتے تھے۔ پہلوان کے لیے تو اپنے قدموں پر چل کر اوپر تک آنا ہی کاروار تھا۔----

لیکن -----

اس کی بیوی داری اور اس کی بیٹیاں دن میں پچاس چکر اوپر نیچے کے لگا لیا کرتی تھیں۔ اس روز مجھے نجانے کیا سوجھی میں جان بوجھ کر ممٹی کے ایک کونے میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اوپر آنے والوں کو دکھائی نہ دے سکوں جب کہ اوپر موجود لوگ مجھے دکھائی دیتے تھے -----

دوسرے ہی لمحے میری حیرت کی انتہا نہ رہی اوپر چھت پر گڈی سائیں اور پہلوان کی بڑی بیٹی عابدہ موجود تھے -----

میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

پہلوان کی بیٹی کے ساتھ گڈی سائیں کا اوپر آنا بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ عابدہ نے متعدد مرتبہ مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ میرے لیے سارا دن سیڑھیوں میں ٹرانسسٹر ریڈیو لگا کر بیٹھی رہتی تھی اور اکثر نور جہاں کے گانے اونچی آواز میں مجھ تک پہنچا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتی تھی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عابدہ خوبصورت تھی۔

لیکن -----

مجھے صرف خوبصورتی نہیں کچھ اور بھی درکار تھا---- وہ کچھ جو نوری میں تھا ---- جو باؤ امین کے گھر دیکھی ہوئی بلیو فلم کی ہیروئنوں میں تھا-----

ہوس کی جن اندھی گلیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا میں گھوم رہا تھا وہاں عابدہ کسی چوکھٹے میں فٹ نہیں بیٹھتی تھی۔

میں نے کم عمری ہی میں اپنے شہر کے بدنام سینما گھروں میں ''ایک ٹکٹ میں دو مزے'' لینے شروع کر دیے تھے۔ میری آئیڈیل کوئی ''ستی ساوتری'' کوئی باکردار اور پاکدامن لڑکی نہیں تھی ---- مجھے تو اپنے جسم کی نمائش کر کے مردوں کے جذبات میں آگ لگا دینے والی آدھ ننگے جسم کی وہ عورتیں پسند تھیں جو ان سنیماؤں کی سکرینوں پر روپہلی حرکت ہوا کرتی تھیں ---- جو انگریزی زبان کے غیر ملکی رسالوں میں اپنی جسم کی نمائش کیا کرتی تھیں اور جن کی ہوس اور گناہ کی وادیوں میں دھکیل دینے والی فلمیں ہمارے گلی بازاروں میں قدم قدم پر کھلے میوزک سنٹر میں کرائے پر ملا کرتی تھیں

ایسی درجنوں فلمیں ہم تین چار دوست باؤ امین کے گھر دیکھ چکے تھے ----- ایسی ہر فلم کے دوران باؤ امین مختلف کریہہ مناظر' دوبارہ چلا کر ہمیں دکھایا کرتا تھا۔ وہ ایسی بیہودہ اور گھٹیا حرکتوں سے محلے کے نوجوانوں کے اندھے جذبات میں ہوس کی آگ بھڑکا کر انہیں بتایا کرتا تھا کہ کس طرح آپس میں چندہ اکٹھا کر کے وہ ''بازاری عورتوں'' کو اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے یہاں لا سکتے ہیں ----

اس نے اپنے گھر کے دروازے ان غلیظ کاموں کے لیے کھلے رکھے تھے۔ دو جوان بیٹیوں کا باپ باؤ امین محکمہ ایکسائز میں انسپکٹر تھا اور ہر عیب کرنا اپنا پیدائشی حق گردانتا تھا۔

ایسے مواقع پر وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کو کسی بہانے گھر سے باہر کسی بھی دوسرے

گھر بھیج دیا کرتا-----

ابھی تک تو میں نے ایسے کسی گھناؤنے کام میں حصہ نہیں لیا تھا-----

لیکن-----

میرے دل میں ایسی خواہش متعدد مرتبہ جنم لے چکی تھی۔ شاید کوئی خوف میرے لاشعور میں سمٹ کر بیٹھ رہا تھا جو مجھے ایسا خطرناک قدم اٹھانے سے روک رہا تھا-----

شاید----- میری ماں کی دعائیں یا باپ کی عمر بھر کی ریاضت کے صدقے اللہ تعالیٰ نے مجھے ابھی تک ان غلیظ حرکات سے محفوظ رکھا تھا۔

باؤ امین جانتا تھا میں جس محکمے میں کام کرتا ہوں۔ وہاں روزانہ سینکڑوں روپے اوپر کی کمائی ہوتی ہے۔

وہ بڑا مکار اور مکروہ شخص تھا۔

اپنے گھر پر وی سی آر اور حرام کاری کی سہولت مہیا کرنے کے عوض وہ نوجوانوں سے ہر کام میں برابر کا حصہ وصول کیا کرتا تھا۔

اسے یہ پریشانی لاحق رہتی تھی کہ آخر میں اپنی حرام کی کمائی کہاں لے جاتا ہوں؟ میں اس کے قابو کیوں نہیں آتا؟

اس نے مجھے چڑانے اور میری غیرت کو للکارنے کے لیے مجھے بڑے بڑے گھٹیا الزامات سے نوازا تھا-----

مجھے "نامرد" ہونے کے طعنے دیے تھے۔

لیکن-----

یہ حسن اتفاق تھا----- میری خوش قسمتی تھی یا پھر والدین کی دعاؤں کا ثمر کہ ابھی تک میں نے "لکشن ریکھا" عبور نہیں کی تھی۔

اتنا ضرور تھا کہ میرے لیے عابدہ ایسی لڑکیوں میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔



گڈی سائیں کا ہمارے کوٹھے پر آنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ وہ دینو پہلوان ہی کا نہیں اس محلے کے کئی گھروں کا پیر بنا ہوا تھا----- ممکن ہے وہ نیچے گرمی سے گھبرا کر اوپر چلا آیا ہو-----

لیکن-----

اس کے ساتھ عابدہ کی موجودگی کوئی نیک شگون نہیں تھا۔

دونوں میری آنکھوں کے سامنے بنے "رونس" پر بیٹھ گئے۔ میں ان سے بمشکل پانچ گز دور چھپا ہوا تھا لیکن جب تک وہ ممٹی کے اندر نہ آتے میں انہیں دکھائی نہیں دے سکتا تھا-----

"سائیں جی----- کچھ بات نہیں بنی"-----

عابدہ کی آواز سنائی دی۔

"دیکھو عابدہ----- ہمارا تعویذ کبھی ناکام نہیں ہوا۔ ضرور تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم نے اپنا وعدہ یاد نہیں رکھا"-----

اتنا کہتے ہوئے اس نے بڑی بے حیائی سے عابدہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں نے کہا ناں میرا کام ہو جائے پھر میں آپ کا کام کر دوں گی"

عابدہ نے یہ کہتے ہوئے بڑی ہلکی سی مزاحمت کرتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے کندھوں سے اٹھا کر الگ کر دیا۔

دیکھ لڑکی----- بے وقوف مت بن۔ تیرا سارا بھید میں جانتا ہوں۔ اگر تیرے اور طیف کے معاشقے کی اطلاع تیرے باپ یا ماں کو ہو گئی تو وہ تجھے کتوں کے سامنے پھکوا

گے ----- تیرا راز بھی رہ جائے گا اور کام بھی ہو جائے گا ---- لیکن تجھے میرا کام کرنا پڑے گا" -----

اس مرتبہ گڈی سائیں کا بچہ بڑا جارحانہ لگ رہا تھا۔

"سائیں جی خدا کے لیے ایسا نہ کریں ----- میں اپنی ماں کی طرح غلط لڑکی نہیں ہوں۔ میں تو باؤ حنیف سے سچی محبت کرتی ہوں۔ میری تو آج تک اس سے کوئی بات بھی نہیں ہو سکی ----- میں نے تو -----

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"بس ----- بس ----- زیادہ ٹسوے نہ بہا اور غور سے سن لے ----- تو مجھے اچھی طرح جانتی ہے میں نے سرداراں کی دونوں بیٹیوں کا کیا حال کروایا تھا ---- اور اس لڑکی شہناز کا کیا حال ہوا تھا ---- تجھے علم ہے ناں سب کا ---- اب سیدھی طرح سے مان جا ورنہ یاد رکھنا کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی -----

یہ کہتے ہوئے اس نے بغیر کسی جھجک کے اس کے ساتھ دست درازی شروع کر دی -----

میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگی تھیں -----

مجھے اب سمجھ آئی کہ عابدہ اپنی تمام کوششوں کے بعد جب مجھے متوجہ کرنے میں ناکام رہی تو اس نے اس "پاکھنڈی" سے تعویز دھاگے کا سہارا لے کر مجھے قابو کرنے کے لیے اس کو اپنے دل کی بات بتا دی تھی اور اب یہ موذی اسے بلیک میل کر رہا تھا ----- اس نے عابدہ کو ڈرانے کے لیے جتنے حوالے دیے تھے۔ وہ سب اسی محلے کی لڑکیوں کے تھے -----

اب مجھے اچھی طرح اس کی اصلیت کی سمجھ آگئی تھی -----

"اف میرے خدایا ----- کیا یہ عابدہ کو بھی ----- کیا گناہ کیا تھا اس بے چاری نے

میں لرز کر رہ گیا۔

اسی لمحے میں نے بڑی مضبوطی سے فیصلہ کیا کہ میں کم از کم ایسی لڑکی کی عصمت دری نہیں ہونے دوں گا جس کا گناہ صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے دل ہی دل میں مجھے محبت کرتی ہے اور محض اس جرم میں اسے اب اپنی عزت کی قربانی دینے پر مجبور کیا جا رہا ہے" -----

مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا ---- زمین پر دوزانو بیٹھے ہوئے میں نے اپنے سامنے رکھی چارپائی کو زور سے ہلایا اور اچانک جو آواز پیدا ہوئی تو دونوں گھبرا کر تیزی سے نیچے اتر گئے -----

تھوڑی دیر بعد میں ممٹی سے باہر نکل آیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیا کروں؟ کچھ بھی ہو مجھے بہرحال اپنے حوالے سے ہونے والی اس زیادتی کو روکنا تھا ورنہ شاید ساری زندگی میں ضمیر کی لعن طعن سے نہ بچ پاتا۔ اگر یہ معاملہ ان دونوں تک محدود رہتا تو اور بات تھی۔

لیکن -----

میرے علم میں آنے کے بعد اب یہ میری مردانگی کے لیے چیلنج بن چکا تھا۔

جہاں تک پہلوان اور اس کی بیوی کا تعلق تھا تو وہ اتنے بے غیرت لوگ تھے کہ اگر انہیں کچھ مادہ نظر آتا تو شاید اپنے ہاتھوں خود گڈی سائیں کو اپنی بیٹی پیش کر دیتے۔



ساری رات کروٹوں کی بھینٹ چڑھ گئی -----

ایک طرف جامنی رنگ والی بلیو فلموں کی ہیروئن نوری تھی -----

دوسری طرف پنجاب کی روایتی فلمی قسم کی ٹیار عابدہ-----

چونکہ ایسے فیصلے دماغ کے بجائے دل سے کئے جاتے ہیں اور دل کے فیصلے انسان کو عموماً گمراہ کرتے ہیں- میں بھی اس گمراہی کا شکار ہوا- میرا دل کسی بھی طرح نوری کے مقابلے میں عابدہ کو دس نمبر بھی دینے پر تیار نہیں تھا-----

مجھے نوری کو حاصل کرنا تھا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے ----- اور دوسری طرف مجھے عابدہ کو اپنے نام پر گڈی سائیں کے ہاتھوں لٹنے سے بچانا تھا خواہ اس کی بھی مجھے کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑتی-----

صبح یوں بھی دفتر سے چھٹی تھی میں دیر گئے تک لیٹا رہا----- جب بستر سے اٹھا تو جسم کا بند بند دکھ رہا تھا- یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بڑی بے رحمی سے میرے جسم کے ایک ایک جوڑ پر ضربات لگائی ہوں-

اپنے کمرے کے ایک کونے میں موجود کھرے پر ہی نہانے دھونے کے بعد میں تیار ہو کر نیچے اترا تاکہ بازار سے دہی لے آؤں گھر والوں نے تو ناشتہ کر لیا تھا- والد صاحب کسی کام سے جا چکے تھے والدہ اور بہن تیار ہو کر ایک بیمار رشتہ دار کی تیمار داری کے لیے جا رہی تھیں-

میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور زندگی میں پہلی مرتبہ ہمت کر کے عابدہ سے بات کرنے کی ٹھان لی- بازار سے ناشتہ لاتے ہوئے میں سیڑھیوں میں بیٹھی عابدہ کو ہاتھ کے اشارے سے اوپر آنے کو کہا-

آج خلاف معمول وہ قدرے سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی- شاید رات کے واقعہ سے خوف زدہ تھی- میرا اسے بلانا بھی اس کے لیے حیران کن ہی نہیں پریشان کن بھی رہا ہو گا- کیونکہ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اسے اس طرح تنہائی میں بلایا تھا-----

عابدہ نے گردن کے اشارے سے صاد کیا اور کچھ دیر بعد وہ اوپر آ گئی ----- اس

سے پہلے کہ وہ میرے اس طرح طلب کرنے کا کوئی غلط مطلب اخذ کرتی میں نے فوراً ہی کہہ دیا-

"عابدہ ----- میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ لینا- میں نے تمہیں کسی اور بات کے لیے نہیں صرف یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ رات تو تم گڈی سائیں سے بچ گئی ہو کیونکہ قدرت نے مجھے تمہاری مدد کے لیے بھیج دیا تھا----- لیکن وہ بڑا کمینہ انسان معلوم ہوتا ہے اور تم اسی طرح اس کے چنگل میں پھنسی رہیں تو نجانے وہ کیا کر گزرے اور-----

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا-

عابدہ کی آنکھوں میں اچانک ہی آنسو آ گئے تھے اسے اب سمجھ لگی تھی کہ رات وہاں اور کوئی نہیں اس کا تصوراتی محبوب ہی موجود تھا-

"میں کیا کروں----- میں بے بس ہوں----- میری ایسی نیت نہیں تھی"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا-

"عابدہ میں تمہاری نیت پر شک نہیں کر رہا- نہ ہی یہ میرا معاملہ ہے- میں تو تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے اپنی حرکتیں جاری رکھیں اور حالات کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی تو خدانخواستہ تم-----

اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا-

"ہاں----- ہاں کہئے کہ میں برباد ہو جاؤں گی- لیکن کس کے لیے- میں اس حرام خور گڈی سائیں پر تھوکتی بھی نہیں- میں تو صرف آپ کو پانے کے لیے اس کے چنگل میں پھنس گئی تھی-----"

یہ کہتے ہوئے اس نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا-

ایک مرتبہ تو میرا دل اچھل کر جیسے حلق میں جا اٹکا-

یہ صورتحال میرے لیے بڑی ہی پریشان کن تھی۔ اگر خدانخواستہ اس کے رونے کی آواز نیچے چلی جاتی یا کوئی اوپر ہی آجاتا تو میرا کیا بنے گا؟ ---- اس صورتحال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

عابدہ عقل کرو ---- بے وقوف مت بنو۔ تمہاری ان حرکتوں سے میرے دل میں تمہارے لیے موجود عزت بھی ختم ہو جائے گی ----"

میں نے اسے قریباً ڈراتے ہوئے کہا پھر اچانک ہی میرا لہجہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

"دیکھو عابدہ ---- میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن یہ محبت کوئی زبردستی کا معاملہ تھوڑی ہی ہے ---- میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا"-----

میں نے روہانسی آواز میں کہا۔

"کیوں"؟

اچانک ہی اس کی سسکیاں تھم گئیں

"اس لیے کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں"

میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔

عابدہ نے ایک لمحہ کے لیے میری طرف دیکھا۔ خدا جانے اس کی آنکھوں میں کیا تھا کہ میں کٹ کر ہی رہ گیا۔

"اچھا حنیف صاحب ---- معاف کیجئے مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔"

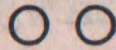
یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے اور میری طرف دیکھے بغیر نیچے چلی گئی ----

میرے دل کو زبردست دھچکا لگا ----

خدا جانے اس لڑکی پر کیا جنون سوار تھا۔ اسے مجھ میں کیا نظر آگیا تھا۔ حالانکہ وہ

نور اتنی خوبصورت تھی کہ آسانی سے سارا محلہ اپنے پیچھے لگا سکتی تھی۔ میں جانتا تھا محمد یار کے دونوں لڑکے دینو پہلوان کے پاس سارا سارا دن کیا لینے بیٹھے رہتے ہیں؟

ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ عابدہ کو اٹھا کر لے جاتے۔ خدا جانے اس عابدہ کے چکر میں محلے کے کتنے نوجوان دینو پہلوان کے مستقل گاہک بن چکے تھے ---- اور وہ ---- مجھ ایسے آوارہ منش اور ناکارہ آدمی سے تمام توقعات وابستہ کیے بیٹھی تھی۔



اگلے روز طے شدہ معمول کے مطابق میں رنگی خاں کے گھر پہنچ گیا ----

گھر پر اس وقت استاد صاحب نہیں تھے۔ نوری بھی شاید کسی کام سے گئی تھی۔

استانی نے مجھے اندر بٹھا کر بشیرے کو آواز دی جس نے ہارمونیم اپنے سامنے رکھ کر میری "آواز لگائی" شروع کروا دی۔

میرے لیے یہ حالات بڑے تکلیف دہ تھے۔

لیکن ----

صبر کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد خدا خدا کر کے استاد رنگی خان آگئے۔

"یار معاف کرنا باؤ ذرا دیر ہو گئی ---- بڑھاپا سالی شے ہی بری ہے۔ میں تو مجلس چلا گیا تھا لیکن واپسی میں خواہ مخواہ دیر ہو گئی۔ آواز لگائی ہے یا نہیں ---- دیکھ بیٹا اب تک تمہارا آواز کلام اچھا نہیں ہو گا یہ سلسلہ آگے نہیں چلے گا ---- حمیداں ذرا چائے تو لانا ----"

استاد صاحب نے مجھے مخاطب کرنے کے بعد اپنی بیوی کو حکم دیا۔

"میں نے گھر میں بھینس نہیں باندھی ہوئی ---- آگیا نکھٹو کا ---- چائے لانا ---- کل سے پتی اور چینی بھی ختم ہے ----"

استاد صاحب کو ملنے والا جواب میرے لیے تازیانہ تھا۔

میں نے فوراً پچاس کا نوٹ نکالا اور بشیرے کو دودھ پتی لانے کا حکم دے کر بھیج دیا۔

"جیتے رہو بیٹا---- جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہو گا"

بشیرے نے میرے ہاتھوں سے سوت پکڑتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کمرے میں نوری داخل ہو رہی تھی۔

"سلام علیکم"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر لاپرواہی سے کہا۔

"اتنی دیر----"

استاد صاحب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ابا جی کام کوئی تھوڑا تھا۔ ان کنجروں کے چاؤ چونچلے تو آپ جانتے ہی ہیں یہ کرو ---- وہ کرو ---- میں نے کل سے وہاں نہیں جانا ---- ثریا کو بھیج دیا کرو" شاید وہ "بیٹھک" سے واپس آئی تھی۔

مجھے علم تھا کبھی کبھی "بیٹھک" والے کام کاج کے لیے استادوں کے گھر والوں کو بھی بلا لیا کرتے تھے۔ ایسا عموماً ان دنوں ہوتا تھا جب کنجروں کے ہاں کوئی خاص تقریب وغیرہ ہوتی تھی۔

"ٹھیک ہے ---- اپنی ماں سے کہنا اسے بھیج دے ---- بچہ ذرا باؤ حنیف کو آواز لگوا دے میں حقہ تازہ کر لوں"

یہ کہتے ہوئے استاد صاحب اٹھ گئے اور نوری ہارمونیم کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

میرے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔

"باؤ جی ---- آپ کسی چکر میں پڑ گئے ہیں ----

نوری نے اچانک ہی کہا تو ایک لمحے کے لیے میں گھبرا اُٹھا ---- لوگ کیا کہیں گے

میں سمجھا نہیں ----

میں نے فی الوقت اس فقرے میں پناہ ڈھونڈی۔

"اچھا"----

اس نے اچانک ہی قہقہہ لگا دیا۔

میں خود کو خاصا شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ گھبرانے والی کوئی بات نہیں تھی ---- لیکن اس کا میری طرف دیکھنے اور بات کرنے کا انداز ایسا جارحانہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

"یہ بڑا مشکل کام ہے باؤ جی ----"

اس نے اچانک اپنی ہنسی روک کر کہا۔

"مشکل یا آسان ---- اب تو شروع کر دیا ہے ---- پہلے سارے کام مشکل ہی ہوتے ہیں ---- پھر آسان ہو جاتے ہیں ---- بس انسان صدق دل سے محنت کرتا رہے" میں نے آغاز کیا۔

"ہم تو غریب ان پڑھ لوگ ہیں باؤ جی ---- گا بجا کر اپنا پیٹ پالنے والے بھلا ایسی باتوں کی کیا سمجھ آئے گی۔"

نوری مجھے پھر طرح دے گئی۔

"میرے خیال سے ہر بات سمجھنے کے لیے انسان کا بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں" میں نے اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکا۔

"اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں ---- اچھا آواز لگائیں"

اس نے اچانک ہی جیسے گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا۔

"نوری ---- دل میں کوئی بات رکھنا اچھی بات نہیں ---- تم شاید کچھ کہنا چاہتی

استاد صاحب کو ملنے وال

میں ۔ نر بھی سہی ---- اب آواز لگالیں"-----

دہا اس نے شاید استاد صاحب کو اس طرف آتے دیکھ لیا تھا---- اس طرح اچانک سلسلہ متکلم ٹوٹنے سے مجھے دکھ سا لگا اور میں نے "سا" کہنا شروع کر دیا۔

بشیرا دودھ پتی لے آیا تھا۔

اس نے باقی پیسے مجھے لوٹانے چاہے میں نے پیسے پکڑنے کے بجائے اسے کہا کہ چائے کا ایک ڈبا اور چینی لے آئے وہ گولی کی طرح واپس بھاگ گیا۔

ہوٹل سے آنے والی دودھ پتی کے میں نے دو کپ تیار کئے ایک نوری کو تھما دیا دوسرا استاد صاحب کو ----

نوری نے بڑی "ناں ناں" کی ---- لیکن میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

"آپ میرے استاد ہیں۔ آپ کے جھوٹے برتن میں چائے پینے سے بھی سرور آئے گا ----"

میں نے چمچہ گیری کے سے انداز میں اظہار عقیدت کیا۔

"جیتے رہو بیٹا ---- تم ضرور اپنے من کی مراد پاؤ گے۔"

استاد صاحب بے چارے سیدھے سادھے آدمی تھے وہ اس بات کو کیا سمجھتے۔

"آمین"

میں نے نوری کی طرف دیکھ کر کہا جس کے ہونٹوں پر پھر وہی پر اسرار سی مسکراہٹ چپک گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد استاد صاحب بیٹھک پر جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ نوری کو انہوں نے دوبارہ مجھے سمجھانے پر لگا دیا پھر اچانک وہ خود ہی کچھ گنگنانے لگی۔ استاد صاحب اس کی غلطیاں بھی نکالتے جا رہے تھے اور مجھے بھی سمجھاتے رہے۔

"بیٹی تجھے کتنی مرتبہ کہوں ریاض کیوں جاری نہیں رکھتی ---- لوگ کیا کہیں گے کہ رنگی خاں کی بیٹی اور اس کا یہ گانا"-----

استاد صاحب نے اسے مخاطب کیا۔

"بس جانے دو ابا جی ---- میں نے کون سا روشن آراء بیگم بننا ہے ---- اتنا ہی کافی ہے ----

نوری نے میری طرف دیکھا اور ہنسنا شروع کر دیا۔

استاد صاحب باہر چلے گئے۔

نوری نے دوبارہ ہارمونیم سنبھال لیا۔

"باؤ جی کیا واقعی آپ سیریس ہیں گانا سیکھنے میں ----"

اس نے اچانک ہی دوبارہ وہی سوال دہرایا۔

"مجھے اس بات کا تو علم نہیں نوری ---- لیکن میرے لیے یہاں تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا"----

اچانک ہی میرے منہ سے سچ نکل گیا۔

"نوری نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ پر یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں بھی ہنسنے لگیں۔

"یہاں کیا رکھا ہے آپ کے لیے ---- آپ بڑے افسر ہیں ---- پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ ہم تو غریب اور ان پڑھ لوگ ہیں باؤ جی ---- چھوٹی قوم کے لوگ ہیں ---- آپ کس چکر میں پڑ گئے ----

اس نے قدرے سنبھل کر کہا۔

"نوری میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے مجھے اپنے دل پر قابو نہیں رہا۔ گانے کا شوق مجھے بچپن سے ہی ہے نوری ---- لیکن

میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح ---- یہ سب تمہارے لیے ہے۔ نوری ---- صرف تمہارے لیے ----"

میں نے لرزتی آواز میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

نوری عورت ضرور تھی ----

لیکن ----

ایک خاص طرح کی عورت ----

جس ماحول میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ جس کنویں میں اس نے جنم لیا تھا اس سے باہر کی دنیا شاید اس کے لیے طلسم ہوشربا تھی۔ ابھی تک اسے اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اس سے عشق بھی کر سکتا ہے ---- وہ تو معمولی سی گانے بجانے والی عورت تھی ---- استاد رنگی خاں کے گھر اس کی پیدائش ایک حادثے کے سوا اور کچھ معنی نہیں رکھتی تھی ----

اپنی برادری میں اس کا باپ "پردھان" کی حیثیت ضرور رکھتا تھا۔ لیکن گھر کی روزی روٹی چلانے کے لیے اسے بھی اپنی ہم عصروں کی طرح گانے بجانے' "بیٹھک" والوں کی خدمت کرنے اور کبھی کبھی اگر داؤ لگ جائے تو کسی شادی بیاہ میں بظاہر اپنی ماں سے نظریں چرا کر کسی نوجوان کو چند منٹ کی جنسی تسکین فراہم کر کے اس سے سو پچاس روپے وصول کر کے اپنے شلوار کے نیفے میں چھپالینا ----

یہی تھا ان کی زندگی کا مقصد ----

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ابھی نوری نے احاطہ بیلی رام کی چند لڑکیوں کی طرح باقاعدہ عصمت فروشی کا دھندہ نہیں اپنایا تھا اور شاید بوس و کنار سے آگے نہیں بڑھی تھی

لیکن ----

کب تک؟

بالآخر اسے بھی بادل نخواستہ یہی کچھ کرنا تھا ----

زمانہ بدل رہا تھا ----

کبھی شادی بیاہ پر میراثنوں کا گانا عیاشی سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ----

اب تو طوائفوں سے بھی بات آگے نکل گئی۔ اب تو میوزک گروپس کے نام پر "اڈز" کی دکانیں کھل گئی تھیں۔

ان حالات میں انہیں کون پوچھتا؟

جن خاندانوں کے شادی بیاہ میں وہ ان کے خاندانی میراثیوں کی حیثیت سے پشت در پشت خدمت کرتے آرہے تھے۔ اب ان خاندانوں نے بھی اپنے اطوال بدل لیے تھے ---- وہ بھی اب "میوزک گروپوں" کی خدمات حاصل کرنے لگے تھے۔

اس بات کا علم سب کو تھا کہ احاطہ بیلی رام کے جس گھر میں کوئی تیکھے نین نقش والی لڑکی موجود ہے ان کا دال دلیا تو اچھا چل جاتا تھا ---- بس یہی تھا کہ ہفتے میں ایک آدھ رات اپنے گھر سے باہر گذارنی پڑتی تھی ---- شاید عام حالات میں وہ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ----

لیکن ----

جب حالات نے ہی بڑی تیزی سے کروٹ بدل لی تھی۔ جب ان کے لیے خود کو زندہ رکھنا ہی کار دارد ہو رہا تھا ---- پھر اور کیا کرتے؟ ----

یہ تو ایک طرح کا سمجھوتہ تھا ---- جو انہی حالات سے بہر حال کرنا ہی پڑا۔

نوری نے بھی یہی سمجھا تھا کہ مجھے استاد رنگی خان کے گھر تک اس کے تیکھے نین نقش' اس کے جسمانی خطوط جنسی ابھار اور میری غلط نیت ہی لے کر آئی ہے ---- اور

یہ اس کے لیے کوئی برا شگون بھی نہ تھا----

مایا خود چل کر اس تک آئی تھی اور گھر آئی لکشمی کو کم از کم نوری تو ٹھوکر نہیں مار سکتی تھی۔ اگر استادی شاگردی کے پردے میں ہمارے جنسی روابط بھی استوار رہتے تو اس کے لیے یہ کوئی مہنگا سودا نہیں تھا---- وہ در بدر رسوا ہونے کے بجائے۔ ایک ہی کھونٹے پر بندھی رہتی ---- یوں بھی ولی محمد نے جس بے رحمی سے ان کے سامنے میری اوپر کی آمدن کا ذکر کیا تھا اس کے بعد سے تو یہ لوگ مجھے سونے کی کان سمجھنے لگے تھے -----



تیسرے روز استاد صاحب نے مجھے "بیٹھک" پر آنے کا حکم دیا---- میں ان کے حکم کے مطابق اس روز "بیٹھک" پر ہی گیا۔

بیٹھک استاد صاحب اس جگہ کو کہتے تھے جہاں وہ بازار حسن میں کوٹھے پر اپنی شاگرد طوائفوں کو مشق کروایا کرتے تھے---- اب لے دے کر یہی ایک ذریعہ آمدن رہ گیا تھا۔ ان لوگوں کی یہ روایت رہی تھی کہ "خاندان گھرانے" کسی نہ کسی کلاسیکی استاد کو اپنے ساتھ "انگیج" رکھتے تھے جو ان کے ممتاز اور منفرد ہونے کی دلیل ہوتی تھی۔

لیکن -----

امتداد زمانہ کے ہاتھوں جہاں اور بہت کچھ تباہ ہوا وہاں یہ روایت بھی اب دم توڑنے لگی تھی۔ اب چند گھرانے ہی ایسے رہ گئے تھے جو اسی طرح استاد صاحبان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔

"الماس بائی" کا شمار بھی ایسے ہی گھرانوں میں ہوتا تھا۔ عمر تو اس کی پچاس سے اوپر ہی رہی ہو گی لیکن اس سے ملنے کے بعد اس بات کا یقین کرنا مشکل تھا۔

الماس بائی خود کو استاد رنگی خان کی شاگرد کہلانے میں فخر محسوس کرتی تھی۔ بھلے

دنوں میں اس نے استاد صاحب کی شاگردی اختیار کی تھی۔ جنہوں نے اسے کم از کم "ٹھمری۔ دادرا" گانے لائق ضرور بنا دیا تھا---- الماس بائی کے بزرگوں نے اس کے لیے اتنی جائیداد چھوڑ دی تھی کہ اگر اس کی سات پشتیں بھی چاہتیں تو آرام چین کی زندگی بسر کر سکتی تھیں۔

لیکن -----

الماس بائی نے اپنے خاندانی پیشے کو خیرباد نہ کہا۔

اس کی دونوں بیٹیاں آج بھی مجرا کر رہی تھیں جب کہ اس کا شمار اب "سیاسی قسم کے کنجر گھرانوں" میں ہونے لگا تھا۔

"گزشتہ سال اس نے جس اسمبلی ممبر کی حمایت کا اعلان کیا تھا وہ کامیاب ہو گیا تھا اور اب بازار کے لوگ اپنے چھوٹے موٹے کام نکلوانے کے لیے اس کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔

اس کام کا "معاوضہ" وہ الگ وصول کیا کرتی تھی کیونکہ ان لوگوں کے الٹے سیدھے کام نکلوانا بھی کوئی "آسان کام" نہیں تھا۔ اپنی دونوں بیٹیوں کو اس نے گزشتہ تین چار ماہ سے باقاعدہ مجرے سے الگ کر لیا تھا۔ اور انہیں بھی استاد صاحب سے "تعلیم" دلا رہی تھی ----- "آواز کلام" تو ان کا بس ایسا ہی تھا۔

لیکن -----

ماں کی سفارش اور دبدبہ کام آیا اور ہفتے میں ایک آدھ دفعہ وہ کسی نہ کسی حوالے سے ٹی وی پر دکھائی دینے لگی تھیں۔

الماس بائی سے متعلق میری معلومات کا ذریعہ اخبارات کے فلمی ایڈیشن ہی تھے۔ اس کے اصلی جوہر تو بعد میں کھلے -----

اس روز میں استاد صاحب کے ساتھ کوٹھے پر گیا تھا۔ جہاں میرا غائبانہ تعارف

استاد صاحب نے شاید پہلے ہی کروا رکھا تھا اور یہی تعارف الماس بیگم کے لیے باعث دلچسپی اور تقریب ملاقات بن گیا۔

"یہ ہے باؤ حنیف----"

استاد رنگی نے میرا تعارف کروایا۔

"بہت خوشی ہوئی آپ نے بہت اچھی لائن اختیار کی ہے ---- گانا تو صرف کلاسیکل گانا ہے۔ میں تو باقی کسی بکواس کو نہیں مانتی ----

یہ کہہ کر الماس بائی نے اپنے نوکر کو میرے لیے چائے لانے کا حکم دیا ---- اس درمیان استاد صاحب نے آواز لگوانی شروع کر دی۔

چائے آئی تو وہ بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"آپ ڈی سی آفس میں ہیں"

اس نے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد مطلب کی بات پر آتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی"----

میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"دیکھئے حنیف صاحب استاد صاحب کے شاگرد ہونے کے ناطے آپ ہمارے پیر بھائی" ہیں اور آپ پر ہمارا حق بنتا ہے"----

الماس بائی نے بڑی کاروباری مسکراہٹ میری طرف اچھالی۔

"بچہ ہے اپنا---- اپنا بیٹا ہے---- تم کو بیٹی کیا کام ہے"----

استاد صاحب نے اپنی مونچھوں سے لگی ملائی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"حنیف صاحب چھوٹا سا کام ہے"----

یہ کہہ کر اس نے مجھے واقعی اس روز ایک "چھوٹا سا کام" بتایا---- میرے نزدیک یہ چار پانچ سو کا کھیل تھا۔

میں نے اگلے رز متعلق کلرک کو اپنا ذاتی کام بتا کر دو سو روپیہ اس کے ہاتھ میں تھمایا جس نے ایک گھنٹے بعد متعلقہ فائل لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ جس کی فوٹو سٹیٹ میں نے کروا لی اور بغل میں دبا کر چھٹی پر سیدھا گھر جانے کی بجائے "بیٹھک" کی طرف چل دیا۔

الماس بائی کو میری طرف سے اتنی زبردست کارکردگی کی توقع شاید نہیں تھی۔ اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے شکریہ ادا کر کے فائل پکڑی اور میرے "ناں ناں" کرنے کے باوجود میرے لیے بوتل منگوالی----

بوتل کے خاتمے پر میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے زبردستی میری جیب میں پانچ سو روپے کا نوٹ ڈال دیا۔

"اسے اپنا ہی گھر سمجھیں---- یہاں آپ کا "ریاض" بھی ہوتا رہے گا"----

ساز سارے موجود ہیں۔

اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"جی ضرور۔ کیوں نہیں"----

میں نے کھسیانا سا ہو کر کہا اور واپس آ گیا۔

یہ کوئی مہنگا سودا نہیں تھا----

الماس بائی بڑی سمجھدار عورت تھی اس نے مجھے صرف استادی شاگردی کے چکر تک محدود نہیں کیا تھا بلکہ میری "کاروباری ضروریات" کو بھی سمجھا تھا۔

اس روز جب میں استاد کے گھر گیا تو میری خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی گھر میں صرف نوری موجود تھی یا پھر بشیرا----

"بیٹھ جائیں ہمارے ہاں خاندان میں ایک مرگ ہو گئی تھی ابا جی وہاں گئے ہوئے ہیں-----

اس نے حسب معمول اپنے جامنی ہونٹوں پر مسکراہٹ جماتے ہوئے کہا۔

"جی شکریہ"-----

کہہ کر میں کمرے میں داخل ہوا اور بڑے ادب سے چٹائی پر وہیں بیٹھ گیا جہاں میں معمول کے مطابق بیٹھا کرتا تھا۔

"جا بشیرے باؤ جی کے لیے چائے لا۔ میرے لیے پان بھی لے آنا-----"

اس نے دوسرا حکم بشیر کو دیا۔

"اچھا باجی----- باجی جی میں دو سموسے نہ لے لوں----- صبح سے -----

"تّے منہ----- جا دفع ہو کمینہ-----"

اس نے بشیرے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

میں سب سمجھتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ یہاں تنہائی کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

"کوئی بات نہیں----- کیوں ڈانٹ رہی ہیں اس بے چارے کو----- یار ہمارے لیے بھی لے آنا" یہ کہتے ہوئے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بشیر کے ہاتھ میں جان بوجھ کر وہی پانچ سو والا نوٹ تھما دیا جو میں الماس بائی کے ہاں سے کما کر لایا تھا۔

"جیتے رہو----- باؤ جی!

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"مر نہ جائیں واپس آجائیں جلدی----- کہیں پانچ سو دیکھ کر وہیں غرق نہ ہو جانا" نوری نے معمول کی زبان میں کہا۔

بشیرا چلا گیا-----

نوری اندر آگئی-----

میں نے احتراماً کونے میں دھرا ہارمونیم اٹھایا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ اسے اپنے اتنے نزدیک دیکھ کر باؤ امین کے گھر والی فلم میرے رگ و پے میں اترنے لگی۔ نوری نے کوئی سستی سی خوشبو لگا رکھی تھی-----

لیکن-----

مجھے نجانے کیوں وہ اپنی اس سستی سی خوشبو اور نمکین رنگت سمیت اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ خدا جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اسے دیکھا تھا۔

خدا جانے اس پل ستاروں کی گردش کیا کہہ رہی تھی۔

ستاروں کی رفتار کیا تھی۔

کون سا سیارہ کس پر حاوی تھا-----

میں اتنا علم نجوم تو نہیں جانتا----- لیکن اس روز میرا برج بڑے کمزور گھر میں تھا اور اس کا سیارہ مجھ پر حاوی ہو گیا۔

وہ کوئی خاص لباس میرے لیے زیب تن نہیں کرتی تھی۔ کوئی سولہ سنگھار کر کے نہیں آئی تھی۔ کوئی فلمی ایکٹریس نہیں تھی----- یہاں بازار حسن میں میرا آنا جانا شروع ہوا تھا وہاں قدم قدم پر ایسی درجنوں لڑکیاں موجود تھیں۔ لیکن

اس میں کوئی خاص بات ضروری ایسی تھی جس نے مجھے باؤلا کر دیا تھا۔ اگر میں نے کوئی "کام شاستر" پڑھا ہوتا۔ اگر میں نے پنڈت کوکا ناتھ کا "کوک شاستر" پڑھا ہوتا تو ممکن ہے مجھے اپنے اس جنون کی وجوہات کا علم ہو جاتا۔

لیکن-----

میں تو بالکل کورا تھا-----

ایک دم اناڑی ----- اور یہ کبھی نہ جان سکا کہ نوری بڑی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے کم از کم پانچ سال بڑی رہی ہو گی لیکن مجھے خود سے دس سال چھوٹی نظر آتی تھی۔

بچپن سے اس نے کنجروں اور شریفوں کے فنکشن بھگتائے تھے ----- اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے مزاروں سے بڑی بڑی گدیوں سکے گدی نشینوں کے ہاں "چوکیاں بھری" تھیں۔ وہ مرد کی آنکھ کے ذریعے اس کے اندر تک جھانک لینے کی قوت رکھتی تھی -----

جس کام ودیا (جنسی علم) کا میں "اٹھک" تھا۔ وہ اس "پاٹھ شالا" کی استاد تھی ----- اس نے میرے اندر موجود ہلچل کو بڑی آسانی سے محسوس کر لیا تھا۔

ہارمونیم کو کھولتے ہوئے اس نے اپنا ململ کا دوپٹہ جان بوجھ کر ضرورت سے زیادہ سرکا دیا تھا-----

لیکن-----

میں تب بھی سمجھا کہ یہ اس کا ذاتی فعل نہیں -----

اس نے میری کمزور نبض کو پہچان کر ماہر حکیموں کی طرح اس پر مضبوط گرفت کر لی تھی اب اسے میری مرضی کی مکمل سمجھ آگئی تھی ----- اور یہ گمان بھی حاصل ہو گیا تھا کہ اس کا علاج بھی اس کے پاس ہے۔

"بسم اللہ کریں"-----

اس نے اپنے موتیوں ایسے سفید دانت جن کی پان چبانے سے صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا چمکاتے ہوئے کہا۔

سا نی رے گا ما.......

میں نے اپنا سبق شروع کیا۔

خدا جانے میرے خشک حلق سے آواز کیسے نکل رہی تھی۔ تو اسے اپنے اتنا قریب کر لیا کہ دم گھٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔

میرے جسم میں تو چنگاریاں دوڑ رہی تھیں۔

"ایمن میں جاتے ہوئے؟ پنچم" نہیں لگائے۔

اس نے مجھے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اوہ! غلطی ہو گئی۔"

میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

"حنیف صاحب یہ بڑا مشکل گانا ہے ----- آپ بابو آدمی ہیں آپ نے کیا شوق پال لیا"

اس نے اچانک ہی ہارمونیم سے ہاتھ اٹھا لیا۔

"نوری ----- آدمی سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کرتا-----"

میں نے پیش رفت کی۔

"کیا مطلب ہے؟ میں سمجھی نہیں"

اس مرتبہ وہ باقاعدہ مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں اس مسکراہٹ کے ساتھ عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔

"میں تمہیں کیا بتاؤں ----- میں بہت" -----

خدا جانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا میں نے اس سے مجھے نوری کے سامنے بچہ بنا دیا۔ مجھے اپنی آواز بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میری آنکھوں میں کہیں آگ اتر آئی ہے-----

مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کب میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

نوری پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

باؤ جی ----- کیا بات ہے۔ آپ کچھ -----

اس مرتبہ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

ہاں نوری تم اس کا کچھ بھی مطلب لو۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں میں نے جب تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا تب میں تمہیں دل دے بیٹھا تھا ----- اور یہاں تک صرف اور صرف تمہارے لیے آتا ہوں ----- نوری اس بات میں بھی ک شک نہیں کہ مجھے بچپن سے گانے کا شوق ہے لیکن اگر تم کسی ڈاکو کی بیٹی ہوتی تو میں اس کے گروہ میں شامل ہو جاتا" -----

جیسے جیسے میں بول رہا تھا نوری کی آنکھوں کی چمک بڑھ رہی تھی۔

شاید احساس تفاخر سے اس کی گردن کا خم بھی سیدھا ہو گیا تھا۔ اپنے مغلوب اپنے سامنے پا کر اس کی خود اعتمادی بہت بڑھ گئی تھی -----

"ہائے باؤ جی ----- ہم چھوٹی ذات کے لوگ ہیں ----- آپ کیسی باتیں کر ہیں"

تب مجھے یہی لگا تھا کہ شاید میرے لہجے کی سچائی، میری آنکھوں میں اترنے نمی نے اسے میری محبت کی سچائی اور گہرائی کا قائل کر دیا ہے۔

لیکن -----

یہ اس کا کاروباری انداز گفتگو تھا۔ اس کا مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔

آج سوچتا ہوں اس میں وہ بے قصور تھی۔ اسے کیا علم کہ سچی محبت کیا ہوتی ممکن ہے اس نے کسی عرس پر گانے گئے سوہنی مہینوال یا ہیر رانجھا بھی یاد کی ----- لیکن حالات نے اسے جس جنم میں دھکیلا تھا وہاں اس کی سوچ کا محور صرف صرف انسانی جسم تھا۔

اسے تجربے نے شاید یہی سمجھایا ہو کہ یہ محبت جسم سے شروع ہوتی ہے اور

پر ختم ہو جاتی ہے۔

"نوری ----- محبت میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا -----"

یہ کہتے ہوئے میں نے بے اختیار اس کے دھرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا خدا جانے اس کے بدن سے کون سی برقی لہریں خارج ہو رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے میرے بازو کے راستے میرے جسم میں مقناطیسی لہریں چلنے لگی ہیں -----

اچانک ہی دروازے پر آہٹ ہوئی۔

میں نے تیزی سے اپنا ہاتھ الگ کر لیا۔

بشیرا اندر آ رہا تھا -----



مجھے تو یوں لگا جیسے میری کوئی چوری پکڑی گئی ہو ----- لیکن، کیا مجال جو نوری ایک لمحے کے لیے بھی ابنارمل ہوئی ہو ----- وہ بالکل نارمل اور مطمئن رہی۔

بشیرے نے ہاف سیٹ چائے اور سموسے ہمارے سامنے رکھ دیے اور باقی پیسے تھما دیے۔

میں نے دس کا ایک نوٹ اس کو تھما دیا اور حاتم کی قبر پر لات مارتے ہوئے کہا جا یار سگریٹ پی لینا" -----

"مولا خوش رکھے باؤ جی" -----

اس نے نوٹ جیب میں ڈالا اور نوری کی طرف دیکھے بغیر باہر چلا گیا۔

نوری نے سامنے "پرچھتی" پر دھرے برتنوں میں سے ایک چینی کی پلیٹ اٹھائی اور اس میں سموسے لفافے سے نکال کر رکھ دیے۔ چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی کھائیے" -----

"نوری تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا" -----

میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"باؤ جی میں کای جواب دوں -----"

یہ کہتے ہوئے اس نے شرما کر گردن جھکالی۔

"میں تمہاری طرف سے اسے "ہاں" سمجھوں ناں نوری"-----

میں نے ندیدے بچوں کی طرح کہا۔

"ہائے اللہ مجھے تو شرم آ رہی ہے ----- آپ کچھ کھائیے ناں"-----

اس نے لجاتے ہوئے کہا۔

حالانکہ -----

اسے شرم بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تو قدرت نے میری شکل میں ترپ کا پتہ دے دیا تھا۔

اب تو اس کی ہر چال سیدھی پڑتی۔

اب تو اسے بہر صورت جیتنا ہی تھا۔

باؤ امین کے گھر دیکھی فلم کی ہیروئن نے اس روز پہلی مرتبہ میری حوصلہ افزائی کی اور میرا ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑ کر فلمی ہیروئنوں کی طرح مجھ سے "قول و قرار" کروانے کے بعد اس پر بوسہ ثبت کر دیا۔

میری بد قسمتی کہ یہ پہلی مہر تھی جو اس روز نوری نے میرے بدن پر لگائی۔ لیکن ..... تب میں اسے اپنی خوش قسمتی پر محمول کر رہا تھا۔

شاید اس روز وہ سب کچھ ہو جاتا جو چند روز بعد ہوا لیکن اچانک ہی دروازہ کے باہر ہونے والی آہٹ نے ہمیں چونکا دیا۔

استاد رنگی خاں تعزیت سے لوٹ آئے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی لیکن کیا مجال جو نوری نے ایک لمحے کے لئے بھی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا ہو۔

وہ تو یوں مطمئن دکھائی دے رہی تھی جیسے یہ اس کے لیے معمولی بات رہی ہو۔ اس کے چہرے پر حسب سابق مسکراہٹ جم گئی تھی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

اس نے ہارمونیم کے سر چھیڑنے شروع کر دیے تھے۔

راگ المن کلیان کی ایک "التھائی" گنگنانے لگی تھی ----- بالکل یوں جیسے وہ میری

"تعلیم" کر رہی ہو----- جیسے وہ مجھے "راگ دیوتا" سمجھا رہی ہو-----

استاد صاحب کو دیکھ کر میں تعظیماً کھڑا ہو گیا لیکن اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

"کمال ہے ابا جی----- یہ آپ کے چار بج رہے ہیں"

اس نے ہارمونیم پر مسلسل ہاتھ چلاتے ہوئے اپنے والد سے گلہ کیا-----

پتر جانا اپنے اختیار میں ہوتا ہے واپس آنا تو نہیں۔ تیری ماں کے رشتہ داروں کا تجھے کیا علم نہیں ہے-----"

استاد رنگی خان نے کھڑے کھڑے کہا پھر وہ ہمارے ساتھ ہی آ کر بیٹھ گئے۔

سموسے جوں کے توں دھرے تھے۔ سوائے ان دو کہ جو ہم دونوں نے کھائے۔

استاد صاحب نے نوری کے کہنے پر ایک سموسہ اٹھا لیا۔ سموسے کھانے کے بعد انہوں نے اپنی مونچھیں صاف کیں اور نوری کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

نوری نے ان کا مطلب سمجھ کر دوبارہ وہی "استحقائی" گانا شروع کر دی۔ "حنیف بیٹا! کاپی پر لکھ لو ہم مر گئے تو یاد کرو گے کوئی استاد ملا تھا----- یہ جو راگ ایمن ہے۔ یہ کلیان ٹھاٹھ کا سمپورن راگ ہے----- سارے سر "تیور" میں----- میں دو ہی راگ ہیں سارے "کومل سر" لگتے ہیں اور "ایمن" میں سارے "تیور" سر----- بیٹا تم نے بڑا مشکل شوق پالا ہے----- لیکن گانا اصل میں یہی ہے----- جیسے کلاسیکل کی سمجھ آ گئی بس وہ گویا بن گیا----- راگ کو سمجھ کر گانا ضروری ہے----- لکھ لو----- لکھ لو----- یہ استاد لوگ کسی کو ایسی باتیں بتایا نہیں کرتے۔ بھائی ہم تو سیدھے سادھے لوگ ہیں۔ اللہ بخشے میرے استاد خان صاحب نتھو خان صاحب کہا کرتے تھے----- گانا کبھی نہیں آ سکتا----- حنیف بیٹا سو سال تو اسے گایا جائے اور تین سو سال کی عمر لے کر کوئی دنیا میں نہیں آتا----- گانے سے محبت کرو----- ہم نے اس فن کو اپنا خون جگر دیا ہے

----- لیکن یہ ہے جس دنیا اس کی قدر نہیں جانتی ہائے زمانے نے ہماری قدر نہ کی----- آج استادوں کی بیٹیاں شادی بیاہ کے گیت گا رہی ہیں----- ہائے اے زمانے"

اس روز میں نے اندازہ لگایا کہ استاد رنگی خان کو شاید کسی نشے کی بھی عادت تھی کیونکہ وہ بولتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔

"ابا جی بس وی کرو----- آپ تو شروع ہی ہو جاتے ہو۔ اس میں حنیف صاحب کا کیا قصور ہے"-----

اس نے شاید سمجھ لیا ہو گا کہ ابا جی "تکیہ" سے آئے ہیں۔ تکیہ رجی شاہ پر بازار کے استاد لوگ اکٹھے ہو کر کبھی کبھی بھنگ پی لیا کرتے تھے اور آج استاد رنگی خاں بھی اپنے عزیز کی تعزیت کے بعد واپسی پر ادھر ہی سے ہو کر آئے تھے۔

استاد صاحب خاموش ہو کر دوسرا سموسہ کھانے لگے-----

نوری نے دوبارہ گانا شروع کر دیا شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں عشق و ہوس کے اس کھیل کا بالکل نیا اور اناڑی کھلاڑی ہوں اور ابھی تک گھبراہٹ کے مارے اس قابل بھی نہیں ہو سکا کہ ڈھنگ سے آواز لگا سکوں۔

"حنیف بیٹا آج شام کے بعد ذرا "ڈیرے" کا چکر لگا لینا"

استاد صاحب "بیٹھک" کو کبھی "ڈیرہ" بھی کہہ لیتے تھے-----

میں نے اطاعت گذار شاگردوں کی طرح اثبات میں گردن ہلا دی تھوڑی دیر بعد میں وہاں سے چلا گیا۔

نوری مجھے دروازے تک رخصت کرنے آئی تھی۔

"کوئی ڈھنگ کی خوشبو ہی لگا لیا کرو-----"

میں نے دروازے کے نزدیک پہنچ کر آہستگی سے کہا۔

"ہائے اللہ! آپ لا دیں ناں"-----

اس نے بے ساختہ کہا اور میرے بازو کو بڑے عجیب سے انداز میں چھو کر ہٹنے لگی۔ میں دھڑکتے دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی باہر آگیا۔



گھر پہنچا تو والد صاحب اپنی نصیحتوں کا پنڈارہ کھول کر بیٹھے تھے -----

میں نے حسب معمول ان کی باتوں پر کان دھرے بغیر دوسرے کمرے کا رخ کیا اور ٹیپ ریکارڈ پر نئی کیسٹ لگا کر سننے لگا ----- والد صاحب مجھے گالیاں اور بدعائیں دیتے مسجد کی طرف چل دیے کیونکہ تھوڑی دیر بعد عشاء کی اذان ہونے والی تھی۔

لتا کا کوئی پرانا گانا چل رہا تھا اور میرا بایاں ہاتھ بار بار دائیں ہاتھ کی اس جگہ پر چلا جاتا تھا جسے نوری نے مضبوطی سے چھوا تھا -----

استاد صاحب کی طرف سے اسی روز شام کے بعد "ڈیرے" پر آنے کا پس منظر اب مجھے کچھ کچھ سمجھ آنے لگا تھا۔

الماس بائی کی زمانہ ساز آنکھوں نے میری قدر پہچان لی تھی۔ میں نے اسے پہلے روز جو کارنامہ کر دکھایا تھا اس کسی شاید اسے توقع نہیں تھی۔

استاد صاحب کو یہ علم نہیں تھا کہ میں آج یہاں آنے سے پہلے اس سے مل کر آیا ہوں یا شاید اس کے بعد الماس بائی کو کوئی کام یاد آگیا تھا۔

"آج میں گھر کھانا نہیں کھاؤں گا "اماں بی" -----

میں نے والدہ سے کہا۔

"کیوں بیٹا ----- یہ روز روز بازار کے کھانے کھانا شریفوں کا شیوہ نہیں۔"

میری ماں نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

"اماں جی ----- آپ بھی ابا جی کی طرح خواہ مخواہ مجھ پر شک کرتی رہتی ہیں -----

کیا آپ چاہتی ہیں میں بھی ساری زندگی اس کھولی میں جانوروں کی طرح گذار کر مر جاؤں ----- آج میں نے اپنے نئے افسر کی پارٹی کی ہے ----- مل کر انہیں رات کا کھانا ایک ہوٹل میں کھلا رہے ہیں ----- اگر میں وہاں نہیں جاؤں گا تو وہ اس کا کیا مطلب لیں گے ----- آپ کو سمجھ ہے اس بات کی ----- کیوں آپ بھی ابا کی طرح ہاتھ دھو کر میری نوکری کے پیچھے پڑی ہیں ----- اماں بی ----- ہم نے ساری زندگی ابا حضور کی پنشن پر نہیں بسر کرنی -----

میں نے اپنی ماں کے سامنے بڑی صفائی سے جھوٹی کہانی سنا دی۔

"اچھا بیٹا ----- جیسی تیری مرضی ----- تیرے ابا نے تو کبھی ایسی پارٹیاں نہیں دیکھی تھیں۔" بے چاری ماں نے ہتھیار ڈال دیے۔

"اس لیے تو اس نے ترقی کی ہے ----- آدھا محلّہ ہمارا ہی ہے اور تین چار گاڑیاں الگ سے چل رہی ہیں۔"

میں نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

ماں نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور نماز کے لیے وضو کرنے لگی۔



والد صاحب کے مسجد میں جانے کے بعد میں نے اپنا نیا سوٹ زیب تن کیا اور ڈیرے کی طرف چل دیا حیرت کی بات تھی کہ آج آتے اور جاتے ہوئے عابدہ دکھائی نہیں دی حالانکہ وہ عموماً کسی نہ کسی بہانے ان اوقات میں سیڑھیوں میں آکر بیٹھ جایا کرتی تھی۔

میں بازار میں سے گذرنے کے بجائے ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسرے راستے سے الماس بائی کے ڈیرے پر پہنچا تھا۔

رات ہو رہی تھی -----

لیکن -----

ابھی بازار باقاعدہ نہیں کھلا تھا۔

چوروں کی طرح بازار کے لوگوں سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے میں الماس بائی کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

دروازہ کھلنے پر مجھے نوکر کی شکل دکھائی دی جس نے شاید مجھے پہچان لیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے جب اس نے میری آمد سے کمرے میں بیٹھے لوگوں کو مطلع کیا تو میرے کمرے کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی الماس بائی ننگے پاؤں باہر آچکی تھی۔ "جی آیاں نوں ----- جی آیاں نوں-----

اس نے آنکھوں میں کاروباری چمک لاتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔

میں اسے سلام کر کے کمرے میں چلا آیا۔

یہاں کا منظر ہی نرالا تھا-----

استاد رنگی خاں شاید اپنی دکان بڑھا رہے تھے کیونکہ ہارمونیم اور طبلے ان کا شاگرد ایک کونے میں رکھ رہا تھا۔ الماس بائی کی بڑی صاحبزادی "پنکی" اپنے تمام تر ناز نخروں کے ساتھ استاد صاحب کے سامنے براجمان تھی اور سامنے آرام دہ صوفے پر دو شخص بیٹھے تھے۔

ان میں سے ایک جس نے اپنی مونچھوں اور سر کے سارے بال بڑے سلیقے سے کالے کروائے ہوئے تھے ہاتھوں میں سونے اور ہیروں کی انگوٹھیاں پہنے بڑے کروفر سے ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور اس صوفے کے دوسرے کونے میں ایک تیس پینتیس سالہ نوجوان جس کی شکل ہی سے مکاری جھلک رہی تھی۔ بتیسی نکالے منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھا۔

"خان صاحب یہ باؤ حنیف صاحب ہیں"-----

اس نے بالکل اس انداز میں میرا تعارف کروایا۔ جیسے بکر منڈی کے قصائی اپنے گاہکوں کو بکرے کی خصوصیات بتاتے ہیں-----

"ہوں"-----

خان صاحب نے اپنی موٹی سی گردن کو جنبش دیدی۔

"حنیف صاحب انہیں تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ ایم پی اے خان صاحب ہیں"----- مجھے فوراً یاد آگیا کہ یہ منحوس چہرہ آخر جانا پہچانا کیوں لگ رہا تھا----- "اور یہ پراچہ صاحب ہیں ----- رپورٹر ہیں اخبار کے"-----

اس نے دوسرے منافق کا تعارف کے ایک مقتدر اخبار کے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے کروا دیا۔

"حنیف صاحب آپ کے اکمل قریشی صاحب ہمارے بڑے مہربان ہیں۔"-----

کرائم رپورٹر نے فوراً اپنی پیشہ وارانہ مہارت کا ثبوت دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی جی آپ سے مل کر-----

میں نے استاد صاحب کو سلام کر کے بعد سے کہا۔

"یار کھانا وانا منگواؤ ناں-----

اچانک ہی ایم پی اے خان صاحب نے بظاہر لاتعلقی سے کہا۔

"حمید----- کہاں مر گیا ہے-----"

اس کے ساتھ ہی الماس بائی کی آواز بلند ہوئی۔

دوسرے ہی لمحے نوکر حمید وہاں موجود رہتا۔

"قادر خراب دیا پتر کہاں دفع مرجاتے ہو"-----

الماس بائی نے بازاری انداز برقرار رکھا۔

بی بی----- میں نے کہاں جانا ہے۔ پراچہ صاحب کے سگریٹ لینے گیا تھا۔" یہ کہہ

کر اس نے سگریٹ کی ڈبیا پراچہ کو تھمادی جس نے باقی پیسے نہیں لیے تھے۔ سگریٹ لینے گیا تھا ---- جا دفع ہو اور خان صاحب کا حکم سن کر کھانے کا بندوبست کرنے جا

الماس بائی نے اس کی نقل اتارتے ہوئے بڑے رعب سے کہا۔

"جو حکم بی بی جی"-----

"جا یار کوئی" شادے" لے آ-----

یہ کہہ کر خان صاحب نے اسے ہزار روپے کا ایک نوٹ تھما دیا۔

"وے غرق ہو ویں ---- میرے واسطے "کھد" علیحدہ لے کر آنا---- بوتلوں کے لیے نیچے کہتا جا اور پان بھی بعد میں لے آنا"-----

الماس بائی نے کھڑے کھڑے ہزار کا نوٹ پورا کر دیا۔

استاد صاحب اسی دوسران اپنی شاگرد پنکی کی طرف ہی متوجہ رہے۔ جس کو خان صاحب کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

حنیف صاحب آپ سے ایک کام آن پڑا ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو ہو جائے گا"-----

الماس بائی نے فوراً ہی تمہید باندھی جس مقصد کے لیے مجھے یہاں طلب کیا گیا تھا۔

"آپ فرمائیں اگر میرے اختیار میں ہوا تو ضرور ہو جائے گا"-----

میں نے عاجزی سے کہا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس ماحول میں قدم رکھتے ہی خود کو بڑا دبا دبا محسوس کرنے لگا تھا۔ ساری زندگی میں نے جس کھولی میں گزاری تھی وہاں تک ایسے ماحول کی کہانیاں تو پہنچتی تھیں۔

لیکن-----

یہ تو میں نے کہیں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اس طرح کوئی اتنی خوبصورت طوائف عزت دے گئی۔-----

"آپ دھڑلے سے کام کریں حنیف صاحب ---- قریش صاحب اپنے یار ہیں کوئی مسئلہ ہوا تو ہم سنبھال لیں گے-----

کرائم رپورٹر نے مداخلت کی۔

میں کوئی ایسا جرات مند انسان نہیں تھا۔

احساس کمتری کا شکار ہوا ایک بہتر درجے کا شہری زندگی میں جرات کے لفظ سے اس شاید آشنا نہیں ہوتا ---- لیکن نہ جانے کیسے میرے منہ سے چڑنے کے انداز میں نکل گیا۔ جناب اگر قریش صاحب آپ کے اتنے ہی دوست ہیں تو آپ کو مشکل کس بات کی ---- آپ ان سے کام کروا ہی لیں۔"

"پراچہ! تم ہر معاملے میں اپنی ناک نہ رگڑا کرو-----"

الماس بائی نے شاید میرے غصے کو محسوس کر لیا تھا۔

یار کبھی چپ بھی رہا کرو ---- تم اخبار والے لکھنے سے زیادہ بولتے ہو"-----

اس مرتبہ خان صاحب نے بھی اسے ڈانٹ پلا دی۔

اور-----

وہ بے شرمی سے دانت نکالنے لگا۔

"جناب جب میری بات کا برا مت منائیں۔ واقعی ہماری عادت ہی ایسی ہوتی ہے"-----

اس نے براہ راست معذرت کی تو مجھے لاشعوری طور پر اپنی اہمیت کا احساس بھی ہو گیا۔

"آپ اسی طرف آجائیں حنیف صاحب"

یہ کہہ کر مجھے الماس بائی دوسرے کمرے میں لے گئی۔

یہ کمرہ کچھ زیادہ ہی سجا سجایا تھا۔ شاید اسے خصوصی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہو گا۔ حنیف صاحب پراچہ کی کسی بات کا برا نہ منائیں ---- میں آپ سے معافی مانگ لیتی ہوں"----

اس نے اس انداز سے یہ بات کہی کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

نہیں ---- نہیں ---- بخدا میرے ذہن میں دور دور تک ایسی بات نہیں۔ میں تو ----"

میں نے کچھ کہنا چاہا۔

لیکن ---- ٹھٹھک کر رہ گیا۔

اچانک ہی کمرے کا پردہ ہٹا اور نوری جوس کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی۔

اس نے مجھے مسکراتے ہوئے ادب سے سلام کیا اور گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔

میں ہکا بکا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

الماس بائی بڑی زمانہ ساز عورت تھی ----

اس کی نظروں سے کیا پوشیدہ رہتا۔ اس نے فوراً میری چوری پکڑ لی۔

"نوری ---- استاد صاحب کی بیٹی۔ میرے ہاں سے بے چاری کام کاج کر جاتی ہے ---- بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ہمارا استاد خانہ ہے ---- مجھے تو کام کرواتے بھی شرم آتی ہے لیکن پھر سوچتی ہوں۔ اسی طرح استاد صاحب کی کچھ مدد ہی ہو جاتی ہو گی۔"

اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے کہا۔

شاید اپنی بات کا ردعمل تلاش کر رہی تھی۔

بڑی گھاگ عورت تھی ----

پہلے ہی روز میری بڑی کمزور نبض پر اس نے گرفت کی تھی

میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ نجانے کیوں نوری کو یہاں دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے بالکل ابتدائی مراحل پر ہی کسی نے میرے ہاتھ میں پکڑا کھلونا جھپٹ کر چھین لیا ہو ----

نوری گلاس رکھ کر مسکراتی بل کھاتی واپس لوٹ گئی۔

اس کے ساتھ ہی خان صاحب وہاں آ گئے ----

"آیئے خان صاحب ---- تشریف رکھیے ---- کچھ منگواؤں آپ کے لیے"----

"نہیں الماس بائی شکریہ ----"

خان صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور میرے سامنے والے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

حنیف صاحب دراصل خان صاحب کا ہی کام تھا۔ میں نے آپ کو اپنا سمجھ کر ان سے ہاں کر دی ----"

الماس بائی نے میرے ساتھ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں جی ---- ضرور کام ہو گا"----

میرے جسم میں اچانک وہی چنگاریاں پھوٹنے لگیں جو نوری کے قریب سے ہوتی تھیں۔

برادرم! ایک چھوٹی سی فائل ہے ---- اختر صاحب کی میز پر رکھی ہے ٹائپ ہونے کے لیے تمہارے پاس کاغذات آتے رہتے ہیں ---- کسی طرح ہمت کر کے فائل کی فوٹو سٹیٹ ہمیں کروا دو ---- خرچے کی پرواہ نہ کرنا ---- بس اسی میں سے ایک کاغذ لانا ہے"----

انہوں نے مجھے اس کاغذ کی تفصیلات سمجھاتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کا ایک بنڈل باہر نکال لیا۔

اس کے ساتھ ہی خان صاحب نے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ گن کر زبردستی مجھے تھما دیے۔ الماس بائی اس دوران جان بوجھ کر کسی کام کے بہانے سے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اتنے نوٹ اکٹھے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

میری تو آنکھیں ہی کھلی کی کھلی رہ گئیں-----

کبھی میری جیب میں ہزار ہزار کے پانچ نوٹ بھی آئیں گے۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میرے تو بدن سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔

پیسوں کی پرواہ نہیں کرنا حنیف صاحب بس کام ہونا چاہیئے۔ پیسے جتنے بھی لگیں ہم حاضر ہیں"-----

ایم پی اے خان صاحب نے میرا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا۔

"خان صاحب آپ بے فکر ہو جائیں۔ کام ہو جائیں گا"-----

میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"حنیف صاحب آپ کی اور ہماری دوستی کا یہ آغاز ہے----- ہم یاروں کے یار ہیں۔ کبھی آپ ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ضرور بتائیں-----اور یہاں بھی کسی شے کی ضرورت ہو تو حکم کریں-----"

اس نے میری طرف دیکھ کر بے حیائی سے آنکھ دبائی۔

عین ان لمحات میں نوری کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ شاید خالی گلاس اٹھانے یا کچھ کہنے آئی تھی۔

"سرجی! کھانا تیار ہے"-----

اس نے خان صاحب سے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے آتے ہیں"-----

خان نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"خدا جانے مالی کہاں سے رنگی خاں کے گھر پیدا ہو گئی تھی-----"

خان صاحب نے میری طرف دیکھے بغیر تبصرہ کیا۔

انہیں کیا معلوم کہ میرے اور نوری کے درمیان کیا رشتہ تھا؟

لیکن-----

ایک بات کا اندازہ میں نے کر لیا کہ نوری کو وہ جانتے ضرور ہیں۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کافی دیر سے یہاں کام کر رہی ہے۔

مجھے کچھ الجھن سی ہونے لگی تھی-----

ایک طرف تو جیب گرم ہونے اور خلاف توقع پیسے ملنے کی خوشی تھی اور دوسری طرف کچھ چھن جانے کا احساس بھی غالب آنے لگا تھا۔

اس کے بعد میں نے نوری کی شکل وہاں نہیں دیکھی۔ شاید وہ استاد رنگی خان کے ساتھ گھر واپس لوٹ گئی تھی کیونکہ استاد صاحب پھر نظر نہیں آئے۔

بازار سے خان صاحب کے ہزار روپے کے سری پائے اور بلو تلوی کا کریٹ آگیا جو ڈائننگ ٹیبل پر سجا تھا۔

میں' ایم پی اے خان صاحب' کرائم رپورٹر پراچہ اور الماس بائی آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک بات میں نے بطور خاص محسوس کی کہ کرائم رپورٹر تو ان سب کا باپ تھا اس کے جوہر تو مجھ پر بعد میں کھلے -----

انسان شاید دنیا کا واحد ایسا جانور ہے جو جان بوجھ کر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی دھوکہ کھانا پسند کرتا ہے۔

میں اب ایسا بچہ بھی نہیں تھا کہ اپنی اس عزت افزائی کا پس منظر نہ جان سکتا!

مجھے علم تھا کہ یہ لوگ مجھ سے کوئی بڑی "واردات" کروانے جا رہے ہیں۔ گو کہ میں اس فائل کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ میری سیٹ ہی ایسی تھی جہاں میری حساس فائلوں تک رسائی ہوتی تھی اور ممکن ہے میرے لیے کسی فائل کو اڑانا اور اسکے فوٹو سٹیٹ کروانا یا اس میں سے کوئی کاغذ غائب کر دینا معمولی بات رہی ہو۔

لیکن -----

ان کے لیے تو میں بہرحال "غیر معمولی" کارنامہ انجام دینے جا رہا تھا۔

میرے دل میں بچپن ہی سے اپنے ماحول اور اپنی غربت کے خلاف جو نفرت بیٹھ گئی تھی اس نے مجھے ان لوگوں کے نزدیک رہنے پر مجبور کر دیا۔ ----- میں چاہتا تھا کہ ان سیڑھیوں اور بیساکھیوں کے سہارے ہی میں زندگی کا ماؤنٹ ایورسٹ سر کر سکتا تھا۔

جس ماحول میں نے جنم لیا تھا وہاں محنت اور ایمانداری کی باتیں' باتوں کی حد تک تو ممکن ہے بہت اچھی رہی ہوں-----

لیکن -----

سچائیاں بہت تلخ اور جان لیوا تھیں۔ جن کا سامنا کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔

میں نے یقیناً یہ سوچا تھا کہ نوری کے ساتھ ساتھ الماس بائی جیسی سیاسی شہرت کی حامل طوائف اور خان صاحب جیسے ایم پی اے کا ساتھ بھی میسر آجائے تو یقیناً سونے پر سہاگے والی بات ہو گئی۔

پھر سب سے اہم بات یہ بھی تھی کہ یہاں نوری کا آنا جانا تھا-----

ممکن ہے اس کے گھر مجھے وہ مواقع نہ ملتے جو یہاں مل سکتے تھے۔

یہی تھے وہ مذموم ارادے اور گھٹیا حالات جنہوں نے مجھے گناہوں کی اس دلدل کی طرف دھکیلا۔

ایک بات میں نے یہاں اور محسوس کی کہ پراچہ نے مجھے مستقبل میں اپنے دوستوں کی لسٹ پر رکھ لیا تھا۔

وہ بڑھ بڑھ کر سالن کی ڈشیں میرے سامنے کر رہا تھا-----

یہی حال الماس بائی کا بھی تھا۔

رات دیر گئے تک ہم کھانا کھاتے رہے۔ جس کے بعد بوتلوں کا دور چلا۔ خان صاحب نے مجھے آفر کی کہ اگر میں چاہوں تو ان کا ڈرائیور مجھے چھوڑ آئے ---- لیکن میں نے انکار کر دیا۔

میرا گھر یہاں سے تھا ہی کتنی دور ---- بمشکل ایک کلو میٹر کے فاصلے پر۔ وہ بھی سارا پر رونق اور اندرون شہر کا علاقہ۔

الماس بائی نے اپنے نوکر سے میری فرمائش پر بطور خاص میرے لیے میٹھا پان منگوایا تھا۔ میں نے ان سے گھر جانے کی اجازت چاہی تو پراچہ بھی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"میں بھی چلتا ہوں ---- میرے پاس تو موٹر سائیکل ہے تھوڑی دیر تک اور گپ شپ رہے گی"----

پراچہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تم بیٹھو پراچہ یار ---- مجھے کچھ کام ہے"----

خان صاحب نے اسے ہاتھ سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

شاید الماس بائی نے خان صاحب کو کوئی خاص سگنل دیا تھا' شاید اس مرحلے پر پراچہ کا مجھے تنہائی میں ملنا ان کے لیے خطرے کا سگنل ہو سکتا تھا----

میں جیسے چوروں کی طرح آیا تھا۔ ویسے ہی چوروں کی طرح واپس لوٹ گیا۔

میرے منہ میں میٹھا پان تھا جس سے اٹھنے والی خوشبو کی لپیٹیں مشام جان کو معطر کر رہی تھی۔ شاندار کھانے کا خمار معدے سے اٹھ کر سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا اور میں ایک سرمستی کے عالم میں گھر کی طرف چلتا چلا جا رہا تھا۔

پولیس سے بچنے کے لیے میں نے وہ راستہ اختیار کیا تھا جو مقامی لوگ اپناتے تھے ---- تماش بینوں والا راستہ ذرا الگ تھا۔

رات گہری ہو رہی تھی جب میں اپنے محلے میں پہنچا ---- ہمارا قریباً سارا بازار سوائے دودھ اور چائے والی دکانوں کے بند ہو چکا تھا----

صبح سے آسمان پر منڈلانے والی بادلوں کی ٹکڑیاں اچانک اکٹھی ہو گئی تھیں اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی جس نے پہلے سے موجود سردی کو دو چند کر دیا تھا----

گلی کی نکڑ پر جلنے والے بلب کی بیمار سی روشنی بمشکل زمین تک پہنچ رہی تھی۔

اچانک ہی بادل اتنی زور سے گرجا کہ میں دہل کر رہ گیا----

اس کے ساتھ ہی لائٹ آف ہو گئی----

ابھی میں گلی میں بمشکل داخل ہی ہوا تھا جب اچانک ساون بادوں کی طرح مینہ کی بوچھاڑ نے مجھے بھگو دیا۔ میں قریباً بھاگتا ہوا اپنے مکان تک گیا ---- مکان تک میرا بخیریت پہنچ جانا اس وقت معجزے سے کم نہیں تھا ---- ورنہ اتنے اندھیرے اور اچانک شروع ہونے والی طوفانی بارش میں کسی کا اس طرح بھاگ کر یہاں تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا----

چبوترے سے گذر کر میں مکان کی ڈیوڑھی میں پہنچ گیا اور یہاں کھڑے ہو کر اپنے منہ اور سر سے بارش کے قطرے صاف کر رہا تھا جب اچانک ہی مجھے پہلوان کے کمرے سے عجیب سی آواز سنائی دی----

میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔



چند روز پہلے رات کے ہونے والا واقعہ مجھے یاد آ گیا اور میں تجسس کے ہاتھوں بے قرار ہو کر بلی کی طرح سیڑھیوں پر قدم رکھتا چار سیڑھیاں اوپر چڑھ گیا----

اب میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے با آسانی پہلوان کے کمرے کا منظر دکھائی دے سکتا تھا----

یہ روشندان صرف نام کا روشندان تھا جس میں لوہے کا ایک فریم نصب تھا
ممکن ہے کبھی اس میں شیشہ بھی لگا ہو -----

کم از کم میں نے اپنی ہوش میں نہیں دیکھا تھا۔ میں اکثر مکان کی سیڑھیاں چڑھتا
اترتا یہاں سے تانک جھانک کر لیا کرتا تھا۔

لائٹ تو آف تھی ----- لیکن اچانک ہی زور سے بجلی کڑکی تو اندر کا ماحول
ثانیے کے لیے روشن ہو گیا -----

خدا کی پناہ ----- جو منظر میں نے ایک لمحے کے لیے دیکھا اس نے میرے تو اوسان
ہی خطا کر دیے -----

کمرے میں تین چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک سے پہلوان کے زوردار خراٹے
ہو رہے تھے۔ پہلوان کے متعلق آدھا محلّہ جانتا تھا کہ وہ افیم کھاتا ہے ----- ایک مر
اس کی آنکھ لگ جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں اٹھا سکتی -----

چوڑی چارپائی پر گڈی سائیں لیٹا تھا جس کے پہلو میں پہلوان کی بڑی بیٹی فوز
لیٹی تھی -----

فوزیہ گوجرانوالہ میں بیاہی ہوئی اور دو بچوں کی ماں تھی -----

فوزیہ اپنے خاوند سے لڑ جھگڑ کر اکثر والدین کے گھر براجمان رہتی تھی۔ اس
خاوند شریف آدمی تھا۔ میں اسے جانتا تھا۔ یہ الگ بات کہ بے چارہ میرے وا
صاحب جیسا شریف آدمی تھا۔

میرے جیسا نہیں -----

اگر وہ میرے جیسا شریف آدمی ہوتا تو شاید دینو پہلوان کی صاحبزادی کو خوش ر
سکتا۔ ان کا اکثر اس بات پر جھگڑا لگا رہتا تھا۔

زمین نے جیسے میرے پاؤں پکڑ لیے -----

یوں تو مجھے سمجھ آرہی تھی کہ یہ مکافاتِ عمل ہے۔ پہلوان اور اس کی بیوی نے
سارے محلے کی لڑکیوں سے متعلق یہی مشہور کر رکھا تھا پھر ان کی ایسی ہی خواہش رہتی
تھی

لیکن -----

نجانے کیوں پھر میرا خون کھول اٹھا -----

فوزیہ شاید دوسرے کمرے میں اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ سو رہی تھی اور اس
موذی کی ہوس پوری کرنے کے لیے اٹھ کر آئی ہو گی۔ کیونکہ بجلی کڑکنے پر میں نے
اسے اٹھ کر اپنے کپڑے سنبھالتے اور گڈی سائیں سے الگ ہو کر دوسرے کمرے کی
طرف جاتے دیکھا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ بھی تصویروں کے چکر میں پھنسی ہے -----

اسے بھی یقیناً گڈی سائیں کے عملیات کے ذریعے اپنے خاوند کو قابو کرنے کا
منصوبہ بتایا ہو گا۔

یہ الگ بات کہ بے چاری خود اس موذی کے قابو میں آگئی تھی -----

میرا فوزیہ سے کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔

لیکن -----

نجانے کیوں مجھے بہت دکھ ہوا۔ ابھی کچھ روز پہلے میں نے عابدہ کو اس موذی کے
چنگل سے رہائی دلوائی تھی اب وہ فوزیہ سے لپٹا ہوا تھا۔ ایسا احسان فراموش شخص ہو گا
----- وہ جس گھر کا کھاتا تھا اس کے برتن میں چھید کر چکا تھا۔

مجھے نظامِ قدرت پر حیرانگی بھی ہو رہی تھی۔

ایک پہلوان کی بیوی داری جو اپنے گھر میں محلے کی نوجوان لڑکیوں کو بلا کر گڈی
سائیں کے سامنے چارے کی طرح ڈال دیا کرتی تھی -----

لیکن ----- کیا اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ تو ایسا سانپ ہے جو اپنے بچوں بھی کھا جاتا ہے-----

میں خون کے گھونٹ پی کر چپ چاپ اوپر آ گیا-----

شاید والدہ میرا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی ----- دروازے کی کنڈی کھلی تھی میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور بغیر آواز پیدا کیے اندازے سے دیوار میں نصب کھونٹی سے رات کے کپڑے اتار کر پہنے اپنے کپڑے وہاں لٹکائے اور چپ چاپ چارپائی پر لیٹ گیا۔

حرام کے پانچ ہزار کمانے -----

الماس بیگم سے تعلقات استوار ہونے -----

نوری کے ہاں کرنے کی ساری خوشی کافور ہو چکی تھی -----

میرے دماغ پر بار بار ایک ہی فلم چل رہی تھی ----- اس فلم میں گڈی سائیں ایک خونخوار درندے کی طرح ونو پہلوان کی شادی شدہ بیٹی فوزیہ کے بدن کو نوچ رہا تھا -----

کاش میں کچھ کر سکتا-----

میری مردانگی میرے لیے طعنہ بن چکی تھی۔

مجھے پشیمانی سی لگ گئی تھی کہ میں عابدہ کی طرح فوزیہ کے لیے بھی کچھ کیوں نہیں کر سکا۔ کم از کم مجھے شور مچا کر سارے محلے کو جگا دینا چاہیے تھا-----

اس گڈی سائیں مردود کا پردہ تو چاک ہوتا۔

محلے کی کچھ بہو بیٹیاں جو مستقبل میں اس کے چنگل میں پھنسنے والی تھیں۔ کم از کم وہ تو اس سے محفوظ رہتیں-----

لیکن -----

میں جانتا تھا۔ ایسا کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے علم تھا کہ اگر میرے شور کرنے پر داری اٹھ بھی جاتی تو مجھے ہی الٹا موردِ الزام ٹھہرا دیتی -----

کوئی ایسا ڈرامہ ضرور رچا لیتی کہ میں ہی الٹا پھنس جاتا۔ جو ہوا' اچھا ہی ہوا-----

لیکن -----

میں نے اس روز اپنے اس عہد کو دہرایا کہ میں کم از کم گڈی سائیں کو یہ گھناؤنا کھیل عابدہ سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ خواہ مجھے اس کی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے-----

اس فیصلے پر پہنچ کر میں قدرے مطمئن ہو کر سو گیا۔

صبح حسب روایت والد صاحب نے میرے جسم سے رضائی اٹھا کر پھینکی تو میں چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ دفتر کا وقت ہو رہا تھا۔ میں اکثر دفتر دیر سے جایا کرتا تھا۔ یہاں میں نے ایسے حالات پیدا کر رکھے تھے کہ عموماً میں دوسروں کی ضرورت رہتا تھا اور مجھے کسی کی ضرورت کم ہی پیش آتی تھی۔

"صاحب بہادر" کے سیکرٹری تک میری رسائی تھی۔ جس کے لیے میں کوئی نہ کوئی "خدمت" کا بہانہ پیدا کئے رکھتا تھا۔ وہ بے چارہ شریف آدمی تھا اور میرے والد صاحب کی وجہ سے خواہ مخواہ میری بھی عزت کرنے لگا تھا-----

"تیرا باپ ریٹائر ہو چکا ہے لیکن تو ابھی نوکری کر رہا ہے"-----

والد صاحب نے تسبیح پھیرتے ہوئے کہا۔

میں خاموشی سے اٹھا اور کمرے کے کونے میں دھرے حمام سے پانی اپنے منہ پر مارا دانت صاف کئے وہیں بیٹھے بیٹھے شیو کی اور اوپر والی منزل پر ٹائلٹ کیا----- رات کے واقعات فلم کی طرح میرے ذہن میں ابھی تک گردش کر رہے تھے----- پانچ ہزار روپے میرے کپڑوں میں محفوظ تھے-----

میں جانتا تھا اگر اپنی تنخواہ سے ایک روپیہ بھی زائد گھر میں دیا تو والد صاحب مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ اب مجھے حرام کی آمدن کا کوئی جواز پیدا کرنا تھا۔

ایک نوکری میں نے پارٹ ٹائم بھی کر لی ہے"

میں نے ناشتہ کرتے ہوئے والد صاحب سے کہا جو اخبار کے مطالعے میں غرق تھے۔

"شکر الحمدللہ کہ تیرے منہ سے بھی کوئی اچھی بات نکلی"

انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"کمیشن کا کام ہے۔ میرے ایک جاننے والے نے فیکٹری لگا رکھی ہے۔ جتنے آرڈرز مل جایا کریں گے اتنا کمیشن مل جایا کرے گا----- بہرحال میری تنخواہ سے زیادہ ہی آمدن ہو گی انشاء اللہ-----

میں نے مزید جھوٹ بولا۔

"شاباش بیٹا۔ اب تو ہی ہمارے بڑھاپے کی لاٹھی ہے۔ تجھ ہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں-----

والدہ نے مجھے دعائیں دینی شروع کر دیں۔

میں نے اٹھتے ہوئے ایک نظر اپنی بہن پر ڈالی-----

بے چاری خاموشی سے مٹی کے تیل کے چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ کبھی کبھی مجھے اس کی حالت پر بہت رحم آتا تھا۔

لیکن-----

میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے کڑھنے کے----- اس نے زندگی میں کبھی میرے سامنے اونچی آواز سے بات نہیں کی تھی۔ کبھی کوئی گلہ نہیں کیا تھا ----- میری ماں کی طرح چپ چاپ زمانے کی ساری تلخیاں زہر کی طرح اپنے اندر انڈیل لی تھیں----- کیا مجال جو اس خدا کی بندی کے منہ سے کبھی حالات سے متعلق کوئی شکوہ زبان پر آیا ہو----- تو کیا گونگی بن کر بیٹھی رہتی ہے----- تیرے منہ میں

زبان نہیں کیا---- کچھ تو بول دیا کر-----"
میں اکثر اسے چڑ کر کہا کرتا تھا۔

مجھے اس بات پر بہت غصہ آتا تھا کہ ماں کی طرح وہ بھی حالات سے شاکی نہیں اس نے کبھی شکایت کا لفظ زبان پر نہیں لایا۔ مجھے وہ اپنی ماں کا ماضی دکھائی دے رہی تھی۔ اور اس کا مستقبل میری ماں کی صورت میرے سامنے موجود تھا-----

میں نے اپنی جیب سے سو سو کے تین نوٹ جو کل والے پانچ سو میں سے بچے ہوئے تھے نکالے اور اس کو تھما دیے۔

"یہ کیا-----"

والد صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو طعنوں اور گالیوں سے فرصت ملے تو کبھی میری بات بھی سنیں۔ میں گزشتہ دس روز سے یہ جاب کر رہا ہوں----- کل کچھ پیسے ملے تھے----- خدا کے لیے شمیم کو کوئی ڈھنگ سے کپڑے لا دیں

میں نے والد صاحب کی تسلی کروا دی۔

"میں نے کہا تھا کہ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ لیکن مولوی صاحب آپ کو کون سمجھائے؟"

والدہ نے میری بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"چل بس بس----- اب اس کا دماغ نہ خراب کر زیادہ"-----

والد صاحب نے دوبارہ اخبار پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

سیڑھیوں سے نیچے اترا تو دینو پہلوان تھڑے پر بیٹھا غرارے کر رہا تھا----- خدا جانے اس نے کہاں سے سن لیا تھا کہ غرارے کرنے سے ریشہ نہیں ہوتا ہر روز صبح صبح اس کے غرارے کرنے کی منحوس آوازیں ابکائی لے آتی تھیں-----

اب تو ہم اس کے عادی ہو چکے تھے-----

سنا باؤ کیا حال ہے----- آج کل ہمارے پاس نہیں بیٹھتے----- کیا چکر ہے۔ اوئے کوئی اور چکر تو نہیں چل رہا"-----

اس نے بے شرموں کی طرح اپنی ایک آنکھ دباتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں پہلوان جی----- بس وقت ہی نہیں ملتا۔ ایک نوکری سے گزارہ کہاں چلتا ہے۔ شام کو بھی نوکری کر لی ہے"-----

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا اور آگے نکلنا چاہا لیکن اس موذی نے کھڑے ہو کر میرا راستہ روک لیا۔ شہزادے----- آج کل سائیں جی ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں۔ اس روز تو بڑے نوٹ دے رہا تھا۔ پھر غائب ہو گیا----- اوئے بڑے اللہ والے بندے ہیں بھئی خلق خدا بہت فائدہ اٹھا رہی ہے----- وہ مائی رسولاں نہیں تھی----- دیکھ کر اس کی دونوں بیٹیوں کے لیے بر مل گئے ہیں----- سائیں جی کی دعاؤں کی برکت ہے۔ تم تو جانتے ہو دونوں باری باری رنگے ہاتھوں پکڑی جا چکی ہیں----- لیکن سائیں جی نے ایسا علم پڑھا کہ اندھا ہی کر دیا----- ایک کا خاوند دوبئی میں ڈرائیور ہے اور دوسری کا دکاندار----- دونوں کا نہ اگلا نہ پچھا----- موجیں کریں گی----- میں تو کیا ہوں شہزادے تم بھی سائیں جی سے کوئی فائدہ اٹھا لو----- ایسا عمل کریں گے کہ تمہارے افسر ملازموں کی طرح تمہارے پیچھے پھریں گے"-----

وہ نجانے اور کیا کیا بکواس کرتا جب اچانک کمرے سے گڈی سائیں کی آواز بلند ہوئی "دینو پہلوان جلدی کرو بھئی----- ہم نے بڑی سرکار سے عرس پر بھی جانا ہے۔ بہت لوگ انتظار کر رہے ہوں گے وہاں-----"

"اچھا جی سائیں جی----- جو حکم بادشاہو! مالکو! حاضر ہوا"-----

دینو نے میری جان چھوڑی اور سامنے کمرے میں گھس کر اپنی بیٹیوں کو ننگی گالیاں نکالنے لگا کہ ابھی تک انہوں نے ناشتہ کیوں نہیں تیار کروایا-----



دفتر پہنچ کر حسب معمول حاضری لگانے کے بعد سیکرٹری صاحب کے حضور حاضری دی۔ میں نے بڑے احترام سے سلام کیا اور والد صاحب قبلہ کا سلام پہنچایا۔ یہ میری نارمل پریکٹس تھی-----

میں اکثر میں ایک دو مرتبہ انہیں اس بات کا احساس دلاتا رہتا تھا کہ میں مولوی صاحب کا صاحبزادہ ہوں۔ اور میرا خصوصی خیال رکھنا ان کا فرض ہے۔

"بیٹا کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی-----

انہوں نے والد صاحب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا۔

"نو سرا آپ کے ہوتے ہوئے بھلا مجھے-----

میں نے بڑی انکساری سے تقریباً شرماتے ہوئے کہا۔

"کوئی مسئلہ ہو تو بیٹا مجھے ضرور بتانا----- اللہ تعالیٰ اپنی صحت عطا فرمائیں میں نے تمہارے والد صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے"-----

انہوں نے سینکڑوں مرتبہ کہا ہوا فقرہ دہرایا اور میں سلام کر کے اپنی میز کی طرف واپس لوٹ گیا۔

"کیا بات ہے حنیف صاحب کچھ زیادہ ہی لیٹ ہونے لگے ہیں آپ-----

میرے انچارج قاضی صاحب نے اپنی ناک پر دھری عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"قاضی صاحب آپ میرے بجائے سیکرٹری صاحب سے پوچھ لیا کریں۔ مجھے کوئی شوق نہیں دیر سے آنے کا----- صاحب کا کام نہ کیا کروں تو فرمایئے-----

اور-----

بے چارے قاضی صاحب کا منہ لٹک کر رہ گیا۔

بڑا ٹھکا ہے بھئی اپنے شہزادے کا"-----

میرے ہم کار نے بیٹھنے پر کہا۔

"نہیں یار----- اللہ کی دین ہے----- افسر مہربان تو بندہ پہلوان-----

میں نے کہا اور ولی محمد کو آواز دی۔ جواب خواہ مخواہ خود کو میرا محسن سمجھنے لگا تھا۔

[illegible] باؤ جی----- ریاض جاری ہے ناں"-----

اس نے میرے نزدیک آکر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"یار تجھ سے کئی مرتبہ کہا ہے یہاں ایسی بکواس نہ کیا کر-----

میں نے چڑنے کے انداز میں کہا کہ وہ کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔

"غلطی ہوئی جناب آئندہ خیال رکھوں گا"-----

اس نے رٹا رٹایا فقرہ دہرایا۔

"جیو شہزادے----- جیتے رہو"-----

میرے ساتھیوں نے نعرہ تحسین بلند کیا-----

فائل جس کی مجھے ضرورت تھی قاضی صاحب کی میز پر دھری تھی۔ میں نے یہ [illegible] اک انہی کے لیے پھیلایا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد چائے اور سموسے میرے اشارے پر ولی محمد نے قاضی صاحب کی [illegible] ہی رکھ دیئے جن کی رال مسلسل ٹپک رہی تھی۔

سموسے کھاتے اور چائے پیتے ہوئے قاضی صاحب مسلسل میری تعریفوں کے پل [illegible] رہے تھے۔ جب کہ میری نظریں اسی فائل پر لگی تھیں جس پر سرکار بنام غلام [illegible] لکھا تھا۔

ہوا تو سب لوگ کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان میں سے نماز کوئی نہیں
-- نماز کے لیے حاصل سہولت سے بہرہ ور ہونا سب اپنا حق سمجھتے تھے
معمول کی طرح بظاہر ان کے ساتھ ہی باہر نکلا تھا۔

ں لمحے اس طرح اندر آیا جیسے میں کچھ بھول گیا ہوں۔
دھڑکتے دل، لیکن ----- بڑی جرات سے متعلق فائل اٹھائی اور دوسرے
ے باہر نکل گیا۔
ھیوں کے نزدیک موجود فوٹو سٹیٹ مشین سے میں نے ایک ایک کاغذ
نکلوائے ---- یہاں پر کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی جس کا کوئی نوٹس
ب دفتر واپس پہنچ گیا ----
بارہ اپنی جگہ رکھتے ہوئے میں اس میں سے وہ کاغذ غائب کرنا نہیں بھولا
خاص ہدایت ایم پی اے خان صاحب نے کی تھی ----
نی آسانی سے سر ہو جائے گا ----
بھی وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی۔
اتنے سے کام کے لیے پانچ ہزار ----"
ں میں کہا اور خان صاحب کی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی۔
نماز کے وقفے کی وجہ سے کچھ مہلت حاصل تھی۔ میں نے فوٹو سٹیٹ
فے میں بند کر کے اپنے دفتر سے کچھ فاصلے پر موجود اپنے ایک واقف
رکھوائے اور چھٹی ہونے پر وہاں سے اٹھا لیے ----
میں گھر جانے کے لیے بس سٹاپ کی طرف جا رہا تھا جب اچانک ایک
ے نزدیک آ کر رکی ----

"السلام علیکم حنیف صاحب" -----

کرائم رپورٹر پراچہ نے بڑی گرمجوشی سے مجھے یوں سلام کیا جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کے یار ہوں -----

"وعلیکم السلام" -----

میں نے جواب دیا۔

"ادھر کام آیا تھا ---- آپ کو پتہ ہے کرائم رپورٹر ہوں عدالتوں میں تو آنا جانا لگا رہتا ہے کہ اچانک آپ دکھائی دیے ---- میں نے کہا اس موقعے کو کیوں ہاتھ سے جانے دوں -----"

اس نے بے شرمی سے دانت نکالے مجھے بھی خواہ مخواہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانا پڑی۔

"آئیے ناں جناب آپ کو چائے پلائیں ---- آخر آپ ہمارے علاقے میں آئے ہیں ---- میں نے تو یہ نہیں کہہ دیا تھا۔

لیکن -----

اس کے لیے تو جیسے بل کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

"ارے کیوں نہیں جناب ---- نہیں اور پوچھ پوچھ ---- لیکن ایک شرط ہو گی۔"

اس نے میری طرف اس طرح دیکھا کہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا -----

"کیا؟"

"آپ کو چائے میری پسند کے ہوٹل میں پلانا پڑے گی۔"

اس نے عجیب سے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

"پراچہ صاحب جہاں آپ حکم کریں" ----

میں نے کہا۔

پراچہ نے مجھے اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھایا اور یہاں سے ڈیڑھ دو کلومیٹر
واقع ایک چھوٹے سے صاف ستھرے ریستوران میں آگیا----

یہاں کا عملہ شاید اسے پہچانتا تھا۔ تمام لوگ اس کو احترام دے رہے تھے----

پراچہ نے بڑی پر تکلف چائے کا آرڈر دیا اور چائے پیتے پیتے ادھر ادھر کی با
کرنے کے بعد پھر مطلب کی بات پر آگیا۔



"حنیف صاحب اگر آپ برا نہ منائیں تو بڑے بھائی کی حیثیت سے ایک
آپ سے کرلوں"----

"پراچہ صاحب اس کے لیے کیا اجازت کی ضرورت ہو گی----

میں نے بڑی بے تکلفی سے کہا اس دوران مجھے وہ دلچسپ آدمی لگا تھا۔

"دیکھو حنیف بھائی تم بھی میری طرح غریب آدمی ہو----اور اس معاشرے
ہر شخص غریب کے استحصال پر تلا ہوا ہے۔ کل جب الماس بائی کے ہاں سے تم آ
تھے تو میں نے چاہا تھا کہ کسی بہانے تمہارے ساتھ باہر جا کر تمہیں یہ بات بتاؤں
موقع نہیں مل سکا----"

اس نے سنجیدگی سے بات شروع کی----

"حنیف صاحب اصل بات تو یہ ہے کہ الماس بائی اور خان صاحب صرف
طوائف اور ایم پی اے نہیں---- بلکہ دونوں اس ملک کے "انڈر ورلڈ" میں بڑی
شخصیات سمجھے جاتے ہیں----اس شہر میں ڈرگ کا پچاس فی صد سے زیادہ بزنس
صاحب کا ہے اور الماس بائی ان کی برابر کی حصہ دار ہے---- میں ایک ذمہ دار
نویس ہوں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک کارندے کی طرح ان
ساتھ کام کر رہا ہوں---- لیکن، میں اپنی ڈھنگ کی قیمت خرید وصول کرتا ہوں

جس کام کے انہوں نے تمہیں پانچ ہزار روپے دیے ہیں---- میں نے اس کے پچاس
ہزار روپے طلب کیے تھے کیونکہ انہیں اس چھوٹے سے کام سے پانچ لاکھ سے زیادہ کا
فائدہ ہوتا"----

وہ بولتا جا رہا تھا اور میں ہونقوں کی طرح اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا----

میرے ذہن میں تب ایک ہی بات آئی کہ شاید پراچہ میری ضرورت سے زیادہ
عزت افزائی سے چڑ گیا ہے اور اب مجھے ورغلا رہا ہے----

تب، میرا گمراہ ذہن اس سے زیادہ کیا سوچ سکتا تھا؟

"پراچہ صاحب آپ کا شکریہ۔ میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا"۔ میں نے
پھر بھی اس کا دل توڑنا مناسب نہ جانا۔

جس دفتر میں میں کام کر رہا تھا وہاں رہتے ہوئے مجھے احساس تھا کہ ایک اخبار کے
کرائم رپورٹر کی معاشرے میں کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔ یہ لوگ ایسے کام کر سکتے تھے
جن کا بڑے بڑے افسروں سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں پراچہ کو ہاتھ سے گنوانا نہیں
چاہتا تھا۔

ایک بات کا علم البتہ مجھے پہلے سے تھا کہ ایم پی اے خان صاحب کوئی عام قسم کا
ایم پی اے نہیں ہے۔ واقعی اس کا ڈرگ کا دھندہ اس شہر میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا
اور یہ بھی کہ الماس بائی حکمران پارٹی کی اس علاقے کی چھوٹی موٹی عہدے دار
تھی۔----

لیکن----

یہ دونوں باتیں بھی تو میرے حق میں بہتر نہیں۔

میں پراچہ کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور وہ مجھے اشارے کنایے سے ان دونوں کے
کالے کرتوت سناتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ان لوگوں میں پھنسا ہوا ہے اور ایک

دوسرے سے نفرت کے باوجود یہ لوگ ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔

پراچہ نے مجھے دوستی کی پیش کش کی اور میں نے صدق دل سے قبول کرلی۔ اس نے مجھے یہ نہیں پوچھا کہ میرے پاس کس طرح کے کاغذات پکڑے ہوئے ہیں۔ کافی دیر تک ادھرادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

"کام تو ہو گیا ہو گا---- شاید یہی فائل ہے"----

اس نے بڑا نفسیاتی حربہ آزمایا تھا۔

"نہیں"----

میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

"کیا مطلب"----

پراچہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

"پراچہ صاحب یہ اتنے آسان کام نہیں ہوتے۔ آپ خود سمجھدار آدمی ہیں اس طرح فائلیں نہیں ملا کرتیں"----

میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"حنیف صاحب مجھے تو علم ہے اس بات کا۔ مجھے اگر وہ یہ کام کہتے تو کون کافر کا بچہ پچاس ہزار سے کم ایک پیسہ بھی لیتا----"

اس نے بڑی گرم جوشی سے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد ہم نے اپنے اپنے دفاتر کے فون نمبروں کا تبادلہ کیا اور اپنی اپنی راہ لی۔

پراچہ مجھے اپنے گھر کے بازار تک چھوڑنے آیا تھا۔ میں نے شکریہ کہہ کر اسے یہیں سے رخصت کر دیا۔

اگر وہ میرا گھر دیکھ لیتا تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ جاتی۔

لیکن----

اس مرحلے پر میں خود اسے گھر لے جانا نہیں چاہتا تھا۔

والد صاحب عموماً اس وقت گھر ہوتے تھے اگر ان کی نظر ان کاغذات پر پڑ جاتی تو قیامت لے آتے اور میری وہ درگت بنتی "کہ خدا کی پناہ----

میں نے بھی مناسب جانا کہ سیدھا الماس بائی کے پاس ہی جاؤں اور اسے یہ خوشخبری سناؤں یہ بھی تو ممکن تھا کہ نوری سے وہاں ملاقات ہو جاتی۔

یہ سوچ کر میں نے چند لمحے وہاں توقف کیا اور جب پراچہ اپنی موٹر سائیکل پر آگے نکل گیا تو میں بھی دوسرے راستے پر گامزن ہو گیا----

ایک مرتبہ پھر میں لمبا چکر کاٹ کر بازار حسن کی طرف جا رہا تھا---- میری کوشش یہی تھی کہ اس دوران کسی شناسا چہرے سے بچا رہوں۔

اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو کر میں بالاخر ڈیرے تک پہنچ گیا----

دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔

"آجاؤ---- کون ہے؟"----

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

نوری کمرے کی صفائی کر رہی تھی----

"آپ اس وقت یہاں؟"----

اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں---- مجھے علم تھا نوری تم یہاں ہو گی"----

بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"اوئی اللہ---- آپ تو بڑے وہ ہیں---- آپ کو کیسے پتہ تھا۔"

اس نے بڑے نخرے سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا ملحقہ دروازے کا پردہ ہٹا اور دوسرے ہی لمحے الماس بائی میرے سامنے موجود تھی۔

"آیئے آیئے حنیف صاحب ----- دھن بھاگ ہمارے -----"

اس نے میرے ہاتھ میں بڑا سا لفافہ دیکھ لیا تھا اور اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اس درمیان اس کی گھاگ نظروں نے یقیناً میرے پتے کے پنجر میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے دل کو دیکھ لیا ہو گا-----

تب ہی تو اس نے نوری سے کہا تھا۔

"بیٹھ جا نوری ----- ہر وقت کام پر نہ لگی رہا کر ----- اچھا میں ایک منٹ میں آئی۔ وے مہدے"

وہ جان بوجھ کر اپنے نوکر کو پکارتی دوسرے کمرے میں چلی گئی-----

میں جان گیا کہ اس نے جان بوجھ کر ہمیں تنہائی میں ملنے کا موقع دیا تھا۔ بھلا "نوری" جیسی میری کمزوری اس کے ہاتھ میں آتی اور وہ مجھے بلیک میل نہ کرتی-----

نوری شاید یہاں کے ماحول کو سمجھتی تھی وہ واقعی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا-----

"کہاں ہے میری خوشبو-----؟"

اس نے اچانک ہی سوال داغا۔

مجھے فوراً یاد آ گیا۔ اس کو میں نے خوشبو لا کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن ابھی مجھے موقعہ نہیں مل سکا تھا۔

"نوری میری جان ----- میری طرف سے تم خود خرید لو-----"

یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کی گود میں ڈال دیا ----- نوری نے بجلی کی سی پھرتی سے وہ نوٹ اپنے گریبان میں اڑس لیا اور میرا ہاتھ

تھام کر کھڑی ہو گئی۔

"شکریہ باؤ جی -----"

اس نے کہا اور ایسی حرکت کر ڈالی جس نے میرے سارے بدن پر لرزہ طاری کر دیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ یہاں اتنی جرات سے اور اس طرح پہلی دوسری ملاقات ہی میں مجھ سے لپٹ جائے گی-----

باؤ امین کے گھر دیکھی فلم کی ہیروئن نے وہی کیا جو اس فلم کے آغاز میں ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے ہونٹوں پر دہکتے ہوئے کوئلے رکھ دیے ہوں ----- میرے ہونٹوں پر لگی یہ آگ خون کی طرح سارے بدن میں گردش کرنے لگی تھی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ میں نیم جان اور بے بس ہو کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں بھی آ گئی تھیں-----

شدید سردی میں مجھے اپنا دل گھٹتا محسوس ہونے لگا تھا۔ ایسی کیفیت تو مجھ پر باؤ امین کے گھر فلم دیکھتے ہوئے بھی طاری نہیں ہوئی تھی-----

نوری تو یہ حرکت کرتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی لیکن عین ان لمحات میں اب میں اپنے بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹ رہا تھا دوبارہ پردہ ہٹا اور الماس بائی اندر داخل ہوئی۔

"اگر یہ نوری نہ ہو میں تو مر جاؤں ----- حمیدا تو نرا ہڈ حرام ہے ----- ہڈ حرام کیا کہاں جو اس کو کسی ذمہ داری کا احساس ہو-----

اس نے بظاہر یہی تاثر دیا جیسے اس کی نظر ابھی تک مجھ پر نہیں پڑی پھر اچانک وہ چونک پڑنے کے انداز میں میری طرف دیکھ کر مخاطب ہوئی-----

"حنیف صاحب خیریت تو ہے ----- آپ کچھ-----"

اس کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔

احساس تفاخر سے اس کی گردن تن رہی تھی -----

ایک فاتح کی طرح اس نے مسکراہٹ میری طرف اچھالی۔

اسے یہ امید نہیں تھی شاید کہ میں اتنا کمزور ثابت ہوں گا کہ پہلے ہی حملے میں چاروں شانے چت ہو جاؤں -----

اسے تو اب نوری کی شکل میں ایسی "گیدڑ سنگھی" مل گئی تھی جس کے ذریعے جب چاہتی مجھے اپنی ڈفلی پر بندر کی طرح نچا سکتی تھی۔

"جی کچھ نہیں ---- کوئی بات نہیں" -----

میں نے سنبھل کر کہا۔

اچانک ہی وہ میرے خطرناک حد تک قریب آ کر بیٹھ گئی۔---

"حنیف صاحب کوئی بات تو ضرور ہے ---- ہم آپ کے دوست ہیں، دشمن تو نہیں ---- ہمیں اپنا راز دار بنانے سے آپ کو انشاء اللہ فائدہ ہی ہو گا" -----

اس نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس کی ایک ایک ادا سے کاروباری انداز نمایاں تھا۔

"آپ کا کام ہو گیا ہے ---- لیکن مجھے تو علم نہیں، جس شخص کے ذریعے کروایا ہے وہ پانچ ہزار لینے پر رضامند نہیں ہو رہا تھا ---- بہت پیسے مانگ رہا تھا۔"

میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

"اوہ شکریہ! آپ کی بڑی مہربانی۔ حنیف صاحب آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن ہم بھی احسان کو یاد رکھنے والے ہیں ---- آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ بس کام ہونا چاہیئے۔ یہ جو کام کرنے والے ہیں بہت لالچی لوگ ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ تنگ کرتے ہیں ---- آپ اسے پانچ ہزار سے زیادہ نہ دیں ---- یہ میری طرف سے حقیر نذرانہ آپ کے لیے ہے -----

یہ کہہ کر اس نے دو ہزار روپے اپنے گریبان میں اڑسے پرس سے نکال کر مجھے دیے جو میں نے بے شرموں کی طرح اپنی جیب میں رکھ لیے -----

"شکریہ ---- لیکن آپ یقین کیجیے میں اس لیے آپ کا کام نہیں کرتا ---- مجھے تو

"میں جانتی ہوں حنیف صاحب ---- طوائف ضرور ہوں لیکن عورت بھی ہوں مجھے سب باتوں کا علم ہے ---- خیر آپ مطمئن رہیں ---- ہماری دوستی کا آپ کو بھی فائدہ پہنچے گا ---- حنیف صاحب یہ دنیا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی چلتی ہے ---- اکیلا آدمی بے چارہ کچھ نہیں کر سکتا ----"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"شکریہ آپ واقعی نیک دل خاتون ہیں" -----

میں نے رطب اللسان ہوتے ہوئے کہا۔

ابھی تو میں آپ کو ایسا انعام دینے والی ہوں حنیف صاحب کہ آپ کا دل خوش ہو جائے گا ---- اچھا میں کچھ دیر کے لیے جا رہی ہوں ---- آپ اطمینان سے بیٹھیں ---- یہاں کوئی نہیں آئے گا ---- آپ کے لیے میں نے چائے کا بندوبست کروا دیا ہے ---- نوری کے ساتھ چائے پینے کا یقیناً آپ کو بہت مزہ آئے گا ----"

میرے چہرے کا رد عمل دیکھے بغیر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دوں وہ اچھا خدا حافظ کہہ کر چلی گئی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اسے میرے اور نوری کے درمیان تعلقات کا علم ہے۔ اس نے تو ایک ہی نظر میں میرے دل کے سارے حالات جان لیے تھے۔ عین ممکن ہے کل اس نے نوری کو بھی کرید لیا ہو -----

جہاں میں بیٹھا تھا وہ گناہ کی نگری تھی۔

یہاں تو محترم اور معزز لوگ تو رہتے نہیں تھے۔

ان کمروں میں نہ کوئی اچھا سوچتا تھا نہ کرتا تھا۔

یہاں لوگ برا کرنے، برا سننے اور برا کہنے کے لیے آتے تھے۔ خدا جانے مجھ ایسے
کتنے ان کمروں میں آئے اور اپنا منہ کالا کروا کے چلے گئے۔

نوری استاد رنگی خان کے گھر ضرور پیدا ہوئی تھی۔

لیکن -----

بچپن ہی سے الماس بائی ایسی امیر اور با اثر طوائفوں کے ڈیروں اور بیٹھکوں
گھومنے سے اس نے میری طرح بڑے بڑے نواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔

اس نے جان لیا تھا کہ یہاں بڑا آرٹسٹ بڑا آدمی نہیں ہوتا۔ اگر ایسی بات ہوتی
اس کے باپ سے بڑا آرٹسٹ اس بازار میں کوئی نہیں تھا -----

لیکن ----- اس کے باپ کو ساری زندگی کی ریاضت نے دیا ہی کیا تھا؟ محض چند
تعریفی سرٹیفکیٹ اور چاندی کے بنے ہوئے سنہرے رنگ کے میڈل -----

گزشتہ سال جب استاد رنگی خان صاحب کے لیے بڑے سرکاری ایوارڈ کا اعلان
ہوا تو اس بے چارے کے پاس یہ ایوارڈ وصول کرنے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے بھی
نہیں تھے -----

دوسری طرف یہ طوائف زادیاں جنھوں نے زندگی کی تمام آسائشیں اپنی غلام بنا
رکھی تھیں -----

ان کے آشتانوں پر بڑے بڑے دھنستر خان آکر ناک رگڑا کرتے تھے -----

شاید اس کے ذہن میں بھی کوئی ایسی ہی طوائف آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ بھی چاہتی
تھی کہ اس کنٹری سے جلد از جلد نکلے جہاں انسان اور جانور ایک ساتھ سوتے، رہتے
کھاتے اور پیتے تھے -----

شادی بیاہ اور خوشی کی تقریبات میں چند فلمی گیت گا کر یہاں نام نہاد جعلی قسم کے
وں اور سائیوں کی چوکیاں بھر کر اور ان کی ہوس کا نشانہ بننے سے یہ بہتر نہیں تھا کہ
وہ الماس بائی کی طرح اپنی آواز اور بدن کی ٹھیک ٹھاک قیمت وصول کرے -----

پانچ سو روپے تو وہ ساری رات گانے اور ان تقریبات میں آنے والے لچے
لفنگوں کی حریص نظروں اور کبھی کبھی بے رحم ہاتھوں کا نشانہ بننے کے بعد بھی نہیں کما
پاتی تھی ----- یہاں اسے ایک لمحے میں پانچ سو روپے مل گئے تھے -----

مجھ ایسا بے وقوف عاشق اسے کہاں سے مل سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چائے اور لوازمات سمیت کمرے میں داخل ہوئی تو جامنی سرخ
رنگ کے ملاپ سے بننے والا رنگ اس کے چہرے پر ناچ رہا تھا -----

چائے کی ٹرے سامنے میز پر رکھ کر اس نے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔

"باجی الماس بڑی اچھی عورت ہے" -----

اس نے میرے نزدیک بے تکلفی سے بیٹھ کر کہا۔

"اچھا جی ---- وہ کیسے؟" -----

میں نے بھی حوصلہ کیا۔

"ہائے اللہ ----- خدا جانے باجی کو کیسے تمام باتوں کا پتہ لگ جاتا ہے۔ انہوں نے
فوراً ہی سب کچھ جان لیا تھا اور مجھے تو اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز رکھتی ہیں -----
انھوں نے کہا نوری اس گھر کو اپنا گھر سمجھنا ----- آج بھی وہ بس تنہائی کا موقعہ دے کر
خود چلی گئی ہیں ----"

یہ کہتے ہوئے اس نے میرے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں -----

تمام خدشات، خوف، وسوسے، ایک طرف جھٹک کر میں باؤ امین کے گھر والی فلم
کا ہیرو بن گیا -----

خدا کی پناہ -----

میں اتنا بہادر بھی ہو سکتا ہوں۔

اتنا نڈر اور بے جھجک ہو جاؤں گا۔

آج سوچتا ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔

جنسیت کے غلبے نے مجھ میں درندگی پیدا کر دی تھی -----

نوری کو شاید خصوصی ہدایات کے ساتھ میدان میں اتارا گیا تھا -----

اس نے پہلی ہی باقاعدہ ملاقات میں مجھے ایسا نیک لاک Neck Lock لگایا کہ مجھے زندگی بھر کے لیے جکڑ کر رکھ دیا۔

اگلے چند منٹ میں وہ کچھ ہو گیا جس کے نہ ہونے کے لیے میری ماں نے بائیس سال دعائیں کی تھیں -----

میرے باپ کی ۶۵ سالہ ریاضتیں میں نے ایک لمحے میں خاک میں ملا دیں۔

جامنی رنگت والی نوری جو باؤ امین سے گھروالی فلم کی ہیروئن بن کر میرے اعصاب پر براجمان تھی اس روز میری پاکیزگی کا خون کر گئی۔

اس کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا -----

لیکن، میرے لیے ایک خواب جیسا تھا۔

جب میں اس گھناؤنے عمل سے گزر چکا تو میرے بدن پر لرزہ طاری تھا۔ بالکل ان نو عمر بچوں کی طرح میں خوفزدہ تھا جن کے ہاتھوں سے اپنے باپ کی لائسنس والی بندوق اچانک فائیر ہو جائے اور اس کی گولی بھی ان کے اپنے کسی پیارے کو لگ جائے

اس روز میں نے اپنے باپ کے عظیم آدرشوں ہی کا خون نہیں کیا تھا۔ اپنی نامرادی اور بدبختی پر بھی مہر ثبت کر دی تھی۔

نوری بظاہر گھبرا جانے کی اداکاری کر رہی تھی ----- لیکن، ایک فاتح جیسا تبسم اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھا -----

اور ----- شرم سے میری گردن جھکی ہوئی تھی۔

اس سے نظریں ملا کر بات کرنا میرے لیے کاردار تھا -----

الماس بائی ابھی تک نہیں آئی تھی -----

"اچھا میں چلتا ہوں -----"

میں نے بالآخر اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ ----- بیٹھئے ناں -----"

اس نے میرے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نوری ----- ایک ضروری کام ہے ----- میں کوئی بھاگا جا رہا ہوں ----- شام کو آؤں گا پھر ----- میں نے آہستگی سے اس کے بازو اپنی گردن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

عجیب بات تھی کہ پہلی مرتبہ گناہ کی اس دلدل میں چھلانگ لگانے کے بعد مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔

میں اس صورتحال سے گزرنے کے بعد الماس بائی کا سامنا کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

"اچھا باؤ جی ----- دل تو نہیں کرتا کہ آپ کو جانے دوں ----- لیکن -----

اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ کر میرے بدن پر گناہ کی ایک اور مہر لگا دی -----

میں بظاہر کیف و لذت کے گہرے پانیوں میں تیرتا ڈیرے کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا -----

میرے بدن کی حالت تب ان نشہ بازوں جیسی تھی جنہیں نشے کی حالت میں قریب المرگ ہونے کے بعد اچانک مطلوبہ نشہ مل گیا ہو -----

نوری کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد سے میرے دل و دماغ میں جو آگ سلگ رہی تھی جسے باؤ امین کے گھر والی فلم نے شعلے بنا دیا تھا---- نوری کے ساتھ ملاپ کے بعد جیسے اس دہکتے الاؤ پر کسی نے ٹھنڈی برف رکھ دی۔

ایک سرمستی کے عالم میں رقصاں میں گھر پہنچا تھا----

میری جیب نوٹوں سے بھری تھی---- دل و دماغ پر نشہ طاری تھا---- اس روز پھر گناہ نے مجھ پر غلبہ کیا---- شیطان نے مجھے بہکایا اور مجھے اپنے باپ پر غصہ آیا---- اس کی ساری زندگی کی ایمانداری اسے یہ کچھ نہ دے سکی جو میرے چند منٹ کی بے ایمانی نے مجھے دے دیا تھا----

میرے اندر بیٹھے شیطان نے مجھے گمراہ کیا----

کتنا کم ظرف ہو گیا تھا میں----

کتنا گر گیا تھا میں----

ایسا نیچ ہو گیا تھا----

کاش میری ماں کی کوئی دعا تب قبول ہو چکی ہوتی----

کاش----



میرے لیے بظاہر زندگی میں بے شمار دلچسپیاں پیدا ہو گئی تھیں

استاد رنگی خان کے ہاں آنا جانا مستقل ہو گیا اس بات میں کوئی شک نہیں کہ گانے کا مجھے شوق ضرور تھا اور استاد رنگی خان کے ہاں سے اس کو مہمیز بھی لگی----

اس ملاقات کے قریباً آٹھ دس روز تک میں جان بوجھ کر الماس بائی کے ڈیرے پر نہیں گیا۔ نوری والے واقعے کے بعد سے الماس بائی کا سامنا کرتے خاصی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

اس درمیان نوری بے خوفی کی حد تک میرے قریب آ گئی---- وہ اپنے گھر میں نظر بچا کر میرے ساتھ کوئی نہ کوئی جنسی حرکت ایسی ضرور کر جاتی تھی جس سے میرے خون کو گرمائے رکھتی۔

اس درمیان مختلف تحائف کی شکل میں اپنی حرام کی کمائی کا ایک بڑا حصہ میں اس کو منتقل کر دیتا تھا۔

میری پارٹ ٹائم نوکری کا بہانہ کام آ گیا تھا اور رات کو دیر گئے تک میری آوارہ گردی کا والد صاحب نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

اس روز جب مجھے دس بارہ روز الماس بائی کی بیٹھک پر گئے ہو چکے تھے تو استاد صاحب نے الماس بائی کا پیغام دیا کہ میں لازماً کل اس سے ملاقات کروں----

اس درمیان مجھے دفتر میں دوسرے تیسرے روز کرائم رپورٹر پراچہ کا فون بھی آتا رہتا تھا اور وہ بھی ملاقات پر مصر تھا۔

لیکن----

میری تقسیم کار ایسی تھی کہ جس میں اب پراچہ کے لیے کم از کم گنجائش نہیں رہی تھی----

اگلے روز ایک مقامی تہوار کی چھٹی کی وجہ سے میرا دفتر بند تھا۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ صبح کے وقت الماس بائی کے گھر اجاڑ بیابان کا منظر پیش کر رہا ہو گا کیونکہ یہاں کی رونقیں تو رات ہی کو ختم ہو جاتی تھیں۔ دس گیارہ بجے کے قریب ادھر کا رخ کیا اور معمول کے مطابق خود کو اپنوں کی نظروں سے بچاتا وہاں پہنچ گیا----

دروازے پر نوکر حمیدا موجود تھا----

میری شکل پر نظر پڑتے ہی اس نے خیر ہو باؤ بادشاہ کی---- کا نعرہ بلند کیا اور

بھکاریوں کے سے انداز میں ہاتھ اٹھا کر سلام کر دیا-----

میں نے یہاں کی روایت کے مطابق پیسے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

شاید حمیدے کی آواز اندر پہنچ گئی تھی کیونکہ اب دروازے سے الماس بائی باہر آ رہی تھی۔ وہ شاید ابھی غسل سے فارغ ہوئی تھی کیونکہ گیلے بال اس نے ٹوپی سے باندھ رکھے تھے اور اس کے بدن پر موجود برائے نام لباس بھی بالوں میں آنے والے پانی کی وجہ سے جگہ جگہ سے گیلا ہونے کے سبب اس کے جسم سے چپک رہا تھا۔

لیکن ----- اس کے لیے چونکہ یہ معمول کی بات تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنے بدن سے مزید لاپرواہی کا انداز اختیار کیا اور میرے دائیں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر مصافحہ کرتے ہوئے گلہ داغ دیا۔

"حنیف صاحب یہ تو بڑی زیادتی ہے ----- اس طرح آپ کا یکایک غائب ہو جانا میرے لیے بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ جانے مولا علی مجھے تو یہ پریشانی لگی تھی کہ کہیں ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی ----- برا ہو اس کمبخت سیاست کا اچانک مجھے ٹیلی فون آیا ہمارے صدر صاحب نے طلب کیا تھا ----- سو میں چلی گئی ----- نوری کی خدمت میں کوئی کمی رہ گئی-----

اس نے آخری فقرہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی بے باکی لیکن سرگوشی کے انداز میں بڑا ہی بے ہودہ سا اشارہ کر کے کہا اور بے ساختہ ہنس دی ----- میں بھی کھسیانا سا ہو کر مسکرا دیا-----

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں"-----

میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

ابھی تک اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا-----

"نہیں حنیف صاحب----- کوئی کسر رہ گئی ہو تو معاف کر دیں ----- میں نے ا

کہہ دیا ہے کہ حنیف صاحب ناراض ہوئے تو اس کی خیر نہیں ----- ویسے ہے کمال کی چیز-----"

یہ کہتے ہوئے اس نے سسکاری لی اور بالکل عامیانہ انداز میں ایک فلمی دھن گنگنانے لگی۔

اس درمیان ہم ایک کمرے میں پہنچ گئے تھے اور بستر کے سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"دیکھئے حنیف صاحب شرع میں کیا شرم ----- یہ دل والوں کی دنیا ہے ----- یہاں لوگ اپنا غم غلط کرنے اپنا بوجھ ہلکا کرنے آتے ہیں----- میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرے گھر میں آپ کو ہر طرح سکھ ملے ----- مجھے آپ کی پسند کا علم ہے ----- آپ یہ سمجھئے کہ نوری آپ کی کنیز ہے ----- جب دل چاہے بس حکم کریں میں اسے یہاں بلا لیا کروں گی اور آپ دونوں جی بھر کے دل کے ارمان نکال لیا کریں۔ بھئی آپ کی خدمت کرنا ہمارا بھی تو فرض ہے نا"-----

اس نے پھر مجھے آنکھ ماری اور ہنسنے لگی۔

"شکریہ الماس صاحبہ!"

میں نے بالآخر سنبھل کر کہا اور گردن جھکا کر گویا اظہار شکست بھی کر دیا۔

اس درمیان حمیدا چائے لے کر کمرے میں آگیا تھا۔

اس نے میرے اور الماس کے لیے چائے بنائی اور باہر چلا گیا۔

الماس بائی اس درمیان میرے چہرے کی بدلتی کیفیتوں سے لطف اندوز ہوتی رہی

"حنیف صاحب! آج آپ سے کچھ اہم باتیں کرنی تھیں"-----

اس نے بالآخر مطلب کی بات کرنے کے لیے تمہید باندھ دی۔

"جی حکم کریں"-----

میں نے سر تسلیم خم کیا۔

"نہیں حنیف صاحب یہ حکم وغیرہ تو آپ کے دفتروں میں چلتا ہو گا۔ دوستوں سے اس طرح بات نہیں کی جاتی ---- یہ کہہ کر وہ خطرناک حد تک اچانک میرے نزدیک آکر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن سے لپٹی کسی غیر ملکی خوشبو نے میری روح کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دیے۔

"میں آپ سے مستقل دوستی چاہتی ہوں"

اچانک ہی اس نے میری آنکھوں میں اس طرح جھانکا جیسے اپنی بات کا رد عمل میرے چہرے پر تلاش کر رہی ہو -----

مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کس قسم کی دوستی؟ میری اس الجھن کو شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

"حنیف صاحب یہ دنیا صرف نوری میراثن پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ یہاں آپ کی ہر خواہش کا احترام کیا جائے گا۔ آپ نے صرف ایک کام کرنا ہے"-----

"کیا؟"

میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔

دیکھئے پراچہ نے آپ کو یقیناً میرے اور خان صاحب کے متعلق بہت کچھ بتایا ہو گا۔ میرے لیے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ہمارے بزنس میں ہر سانپ دوسرے سانپ کا دوست ہے ---- ہم اپنی فطرت کے مطابق ایک دوسرے کو ڈنگ مارنے سے بھی باز نہیں رہ سکتے لیکن ایک دوسرے کی مجبوری ہونے کے سبب ایک دوسرے کو برداشت بھی کرتے ہیں ---- اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پراچہ صاحب کام کا آدمی ہے ---- ہماری کوئی لڑکی اگر پکڑی جائے یا کوئی پولیس والا ناجائز تنگ کرے تو پراچہ

ان معاملات کو سنبھالتا ہے۔ خان صاحب کے کام بھی وہ کرتا رہتا ہے ---- لیکن خدا واسطے نہیں اپنا حصہ وصول کرتا ہے ---- آپ کو حیرت تو ہو گی کہ اس کے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھے غصہ نہیں آیا۔ اصل میں ہمارا بزنس میں ایسا ہے کہ یہاں ایک دوسرے کو آخری حد تک برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میری صرف یہ درخواست ہے کہ اس کے ورغلانے میں نہیں آنا اور اسے یہ بھی احساس نہ ہونے دینا کہ تم اس کی اصلیت کو جانتے ہو۔ جہاں تک خان صاحب کا تعلق ہے وہ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی ہے لیکن میں نے بہت محنت سے اسے قابو کیا ہوا ہے ---- تمہیں ایمانداری سے تمہارا حصہ ملتا رہے گا بس ایک کوشش کبھی نہ کرنا ---- خان صاحب سے براہ راست تعلق قائم کرنے کی ---- فائل والے کام کے پانچ ہزار ابھی میرے ذمے باقی ہیں وہ میں تمہیں ابھی دے دوں گی -----"

اس نے مکمل کاروباری انداز سے کہا۔

"شکریہ الماس صاحبہ! انشاء اللہ آپ مجھے ایسا ہی پائیں گی جیسا آپ چاہتی ہیں میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں کہ پراچہ یا کوئی اور مجھے ورغلا سکے گا۔ پھر یوں بھی مجھے سب سے زیادہ ضرورت آپ کی ہے کیونکہ جو آپ میرے لیے کر رہی ہیں وہ پراچہ کا باپ بھی نہیں کر سکتا-----

میں نے مکمل تابعداری سے کہا۔

"تو ہو گئی ناں پکی دوستی -----"

اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"پکی دوستی"-----

میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

الماس بائی نے بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ معانقہ کیا اور میرے بدن کے

سارے تار جھنجھنا کر رکھ دیے۔



اچانک ہی حمید کمرے میں داخل ہوا تھا-----

"بی بی جی----- بی بی جی۔ سائیں بادشاہ آگئے ہیں"-----

اس نے اپنی دانست میں بڑی خوشخبری سنائی تھی۔

"بسم اللہ----- میں صدقے جاواں۔ میں واری جاواں"-----

کہتی ہوئی الماس بائی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"آؤ تمہیں سائیں جی سے ملادیں"-----

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بے تکلفی سے کہا۔

میں نے محسوس تو کیا کہ پہلی ہی باقاعدہ ملاقات میں وہ "آپ" سے "تم" پر آگئی تھی----- لیکن اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا کیونکہ میرے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مجھے اپنے مطلب سے غرض تھی----- نوری کے ساتھ حرام کاری کے لیے مجھے یہاں کھلی آفر تھی اور حرام کی کمائی کے لیے بے پناہ گئی۔ پراچہ نے واقعی ٹھیک کہا تھا وہ ضرور کوئی غیر معمولی فائل تھی جس کا بارہ ہزار روپیہ مجھے مل رہا تھا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ میں ابھی تک پاگل کیوں نہیں ہو گیا۔

جس تیزی سے میرے خواب سچ ہو رہے تھے۔ جس طرح مجھے حرام کی دولت مل رہی تھی جس طرح میری محرومیوں کا برق رفتاری سے ازالہ ہو رہا تھا اس کے بعد مجھے پاگل ہو جانا چاہیے تھا-----

اب میں اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا رہا تھا جہاں اس کے "سائیں جی" موجود تھے-----

اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس معاشرے میں شاید سب سے

اہم کردار "سائیں جی" ہی کا ہے-----

دینو پہلوان کا گھر ہو یا الماس بائی کا ڈیرہ ہر جگہ یہ "سائیں جی" موجود ہوتے تھے۔ خدا جانے یہ معاشرے کے تمام طبقات کے لیے "ناگزیر" کیوں ہونے لگے تھے۔

خدا جانے ان کے پاس ایسی کون سی گیدڑ سنگھی تھی جس کے ذریعے وہ الماس بائی جیسی گھاگ عورتوں کو بھی باندھ کر رکھتے تھے۔

یہی سوچتے ہوئے میں الماس بائی کے تعاقب میں اس کے "ڈرائینگ روم" میں داخل ہوا----- یہ کمرہ مختلف خوشبوؤں سے مہک رہا تھا اور پانچ چھ خوبصورت حسیناؤں کے درمیان گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے جو شخصیت دکھائی دی اس نے ایک لمحے کے لیے تو مجھے بوکھلا کر ہی رکھ دیا-----

یہ گڈی سائیں تھا-----

گڈی سائیں بلاشبہ ان پریوں کے درمیان راجا بنا بیٹھا تھا۔

اس نے مونچھوں پر شاید کوئی تیل لگا رکھا تھا جس سے وہ چمک رہی تھیں اور آنکھوں میں خباثت کے سرخ ذرے تیر رہے تھے۔

حسب عادت اس نے ایک نظر ہم دونوں کو دیکھا اور گردن جھکا لی۔ اس کے چہرے پر مجھے دیکھ کر کوئی خاص تاثر پیدا نہیں ہوا تھا----- شاید اسے یاد بھی نہیں آرہا تھا کہ میں اس سے پہلے بھی کبھی ملا ہوں یا شاید وہ خود کو لاپرواہ ظاہر کر رہا تھا۔

الماس بائی کی تقلید میں مجھے بھی بادل نخواستہ اس کے گھٹنوں کو چھونا اور اس کے مردود و منحوس ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

"جیتے رہو شہزادے----- جیتے رہو"

گڈی سائیں نے میری کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

یہ کیا غلط نہ ہو گا کہ الماس بائی کے ڈیرے پر گڈی سائیں کو دیکھ کر میرے تو ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے تھے۔

خدا کی پناہ یہ شیطان یہاں بھی موجود ہو گا؟

"حنیف بیٹا کہاں بھاگ کر جاؤ گے"-----

میرے اندر چھپے خوف نے سر ابھارا۔

الماس بائی کوئی عام قسم کی طوائف نہیں تھی جس کے ڈیرے پر ایسے عام قسم کے سائیں لوگ چلے آئیں یہاں جرائم کی دنیا کے بھی وی آئی پی ہی آسکتے تھے۔

کیا مجال جو اس موذی نے مجھ سے ذرا سی بھی شناسائی ظاہر کی ہو حالانکہ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اس نے مجھے نہ پہچانا ہو۔ اس کی اہمیت تو میں جانتا تھا ایسے موذی، اور جرائم پیشہ لوگ بڑے باریک بین ہوتے ہیں۔ جس طرح میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس کے سامنے گاتی نوری کو اس کے ذریعے "زور" دی تھی اس کے بعد سے اس بات کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کہ اس نے میرا چہرہ فراموش کر دیا ہو۔

دینو پہلوان کی بیٹی عابدہ نے اس سے میرے لیے تعویز بنوائے تھے۔ یہ تو اللہ کا کرم ہو گیا تھا اس بے چاری پر جو گڈی سائیں کے ہاتھوں بچ گئی ورنہ تو اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ----- پہلوان کی بڑی بیٹی فوزیہ کو میں نے اپنی گناہگار آنکھوں

سے اس راسپوٹین کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھا تھا-----

ہمارے اور اردگرد کے محلوں اور گلیوں کی نجانے کتنی عورتیں اس کی بہیمت کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔

یہاں آکر احساس ہوا کہ یہ کمبخت "کنجروں کابلی سائیں" بنا ہوا ہے-----

"سائیں جی ----- باؤ حنیف صاحب ہمارے نئے دوست ہیں"-----

الماس بائی نے "تازہ بکرے" کی حیثیت سے میرا تعارف کروایا۔

"موج کرے گا----- موج کرے گا"-----

گڈی سائیں نے معمول کی طرح میری طرف دیکھے بغیر مستی کے عالم میں کہا شاید اس نے تھوڑی دیر پہلے چرس پی تھی۔ اس کے اطوار بالکل چرسیوں والے تھے

الماس بائی نے میری طرف دیکھ کر آنکھ دبائی اور مسکرادی۔

شاید اس نے گڈی سائیں کی بات پر صاد کیا تھا۔

وہاں لڑکیوں نے گڈی سائیں کے نزدیک ہو کر اس سے کانا پھوسیاں شروع کر دیں شاید بے چاریاں اپنے "مسائل" ڈسکس کر رہی تھیں۔ گڈی سائیں ہر لڑکی کی بات کے خاتمے پر ایک ہی فقرہ دہراتا تھا۔

"موجاں کریں گی ----- موجاں کریں گی"-----

اور -----

بڑی ڈھٹائی اور بے شرمی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگتا۔

یہ اس بات کا سگنل ہوتا تھا کہ سائیں جی اس سے خوش ہو گئے ہیں اور اس کا کام بن جائے گا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سائیں جی کے سامنے اشیائے خوردونوش کے خوان سج گئے اور وہ وحشیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

اس کے کھانے کا طریقہ اتنے کراہت انگیز تھا کہ اس کی طرف دیکھنے کو بھی دل
نہیں چاہتا تھا لیکن میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس کا جھوٹا اور
کچھا کھانا یہاں طوائف زادیوں کے لیے جیسے تبرک بن گیا تھا۔
وہ سب عام حالات میں شاید ایسے کھانے پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی لیکن ----اب
ایک دوسرے کو دھکے دے کر اور بڑھ چڑھ کر اس گندگی میں حصہ دار بن رہی تھیں
ایک الماس بائی تھی جو میرے ساتھ کونے میں طنزیہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں
سجائے بیٹھی تھی۔ شاید وہ بھی اس کھیل سے دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔
کیونکہ وہ خود اس منافقانہ کھیل میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔
تھوڑی دیر ایسی ہی کچھ بے ہودہ حرکات کرنے کے بعد اچانک گڈی سائیں نے
ایسی فرمائش کر دی جس نے میرے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔
"نوری کو بلاؤ ---- سرکار کا کلام سنائے"-----
اس نے اچانک ہی اپنی نشے میں ڈوبی آنکھیں الماس بائی کے چہرے پر جما کر کہہ
دیا۔ خدا جانے وہ کمبخت کس "سرکار" کے کلام کی بات کر رہا تھا۔
لیکن ----ایک بات عیاں تھی کہ نوری اس کی محافل میں اکثر گاتی رہتی تھی۔
"جو حکم سائیں جی"
الماس بائی نے کہا اور باہر نکل گئی----
میرا تو یہاں دم گھٹنے لگا تھا---- لیکن میں یہاں سے اتنی جلدی اٹھ نہیں سکتا تھا
خدا جانے وہ مردود اس کا کیا مطلب لیتا اور پھر اس کا نوری کو طلب کرنا---- میرے تو
جیسے تن بدن میں آگ سی لگ رہی تھی----
الماس بائی نے شاید کسی کو نوری کے لانے کو بھیجا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر
آ گئی اور دوبارہ بظاہر بڑے خشوع و خضوع سے گڈی سائیں کی مریدنی بن کر بیٹھ گئی۔

اس دوران گڈی سائیں کی حرکات جاری رہیں۔
بازاری تین چار اور عورتیں بھی وہاں چلی آئی تھیں-----
ہر عورت باری باری اس کے نزدیک ہو کر اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی
جواب میں گڈی سائیں اپنی خون میں ڈوبی آنکھیں اس پر گاڑتا اس کے بدن پر غلیظ
ہاتھ پھیرتا اور ---- "موجاں کریں گی ---- موجاں کریں گی----"
کہہ کر دوبارہ اپنی گردن جھکا لیتا----



اچانک ہی دروازے کا پردہ ہٹا اور نوری اپنی ماں اور استاد صاحب سمیت وہاں آ گئی
---- تینوں نے گڈی سائیں کی باری باری قدم بوسی کی۔ گڈی سائیں نے اپنی
ہوسناک نظروں سے نوری کے سراپے کا جائزہ لیا اور "موجاں کریں گی ---- موجاں
کریں گی"---- کہہ کر اس کے ساتھ بھی وہی عمل دہرایا۔
میں نے استاد صاحب کو سلام کیا تو نوری نے چونک کر میری طرف دیکھا-----
میں چونکہ ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھا تھا اس لیے اس کی نظروں سے ابھی اوجھل
تھا۔ مجھے اس محفل میں دیکھ کر وہ کچھ بجھ سی گئی۔
میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری یہاں موجودگی نے اسے کچھ بوکھلا دیا ہے۔
اس نے بھی بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔
"سائیں بادشاہ تیرے آواز کلام کے بڑے دیوانے ہو رہے ہیں نوری"-----
وہاں موجود عورتوں میں سے ایک نے کہا۔
"کرم ہے سائیں جی کا۔ ورنہ ہم کس قابل ہیں بائی جی----"
اس کی بات کا جواب نوری کے بجائے اس کی ماں نے دیا تھا۔

"کوٹھے" پر "سفروئی" (سازندے) کرنے والے آگئے تھے۔ یہ سب استاد رنگی خاں کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ہارمونیم اور طبلے سنبھال لیے تھے۔ استاد صاحب نے تانپورہ پکڑلیا---- نوری اور اس کی ماں نے گڈی سائیں کے سامنے گانا شروع کر دیا۔

"حال نی میرا پیا گھر آیا"

آج خدا جانے نوری کی آواز میں اتنا سوز کیسے آگیا تھا----

آج گاتے ہوئے وہ بار بار میری طرف دیکھتی۔ اس درمیان اس کے چہرے کی مسکراہٹ واپس لوٹ آئی تھی-----

لیکن ----- کیا مجال جو اس کی اس حرکت سے کسی کو کوئی شک گزرتا ہو۔ جب ماں بیٹی نے مل کر اس بول کی تکرار کی۔

شکر ونڈاں پیر مناواں

تو گڈی سائیں نے خدا جانے کیا ڈرامہ رچایا کہ اچانک زور زور سے اپنا سر ہلانا شروع کر دیا۔

وہ "ہال" کھیل رہا تھا۔

جیسے اس پر یہ کیفیت طاری ہو گئی ہو۔ رنگی خاں کی بیوی کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اب تک انہیں ایک مخصوص رفتار سے "ویل" (پیسے) مل رہی تھی۔

اچانک ہی "ویل" کی رفتار بڑھ گئی-----

طوائفوں اور طوائف زادیوں نے "ہال" کھیلتے ہوئے گڈی سائیں پر دو دو اور پانچ پانچ کے نوٹ پھینکنے شروع کر دیے جنہیں رنگی خاں صاحب کی بیوی بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے سمیٹنے لگی تھی۔

قریباً ایک گھنٹہ محفل جاری رہی جب اچانک ہی گڈی سائیں نے ایک ہاتھ کھڑا

کر دیا۔ جس پر یکدم وہاں خاموشی چھا گئی۔ کیونکہ سائیں جی پر "آمد" ہونے لگی تھی۔

اس نے وہاں موجود تین چار عورتوں کے باری باری نام پکارے۔ اس درمیان حیرت انگیز طور پر اس کی آواز بدل گئی تھی۔

جن جن عورتوں کے اس نے نام لیے تھے ان کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کا کام ہو گیا ہے۔

ان طوائفوں نے بڑے بڑے نوٹ نکالے اور گڈی سائیں کو بند مٹھی میں تھمانے شروع کر دیے۔ بلا خوف اس کو وہاں بیٹھے بیٹھے چار پانچ ہزار روپے کی "نذر" ہو گئی تھی۔

محفل برخاست ہونے لگی-----

اب یہاں میں، نوری، الماس بائی اور گڈی سائیں رہ گئے تھے ----- میرے دل کا [illegible] تھا یا پھر نوری کے ساتھ تعلقات کا شاخسانہ کہ مجھے نوری میں اس کی بے پناہ دلچسپی کا احساس ہو گیا تھا

گڈی سائیں نے اسے اپنے بالکل نزدیک بٹھا کر اس کے ساتھ وہی حرکات شروع کر دی تھیں جو وہ اب تک باقی عورتوں کے ساتھ کرتا آیا تھا۔

یہی شاید اس کی نام نہاد فقیری تھی-----

میرا دل شدت نفرت سے گھبرانے اور خون کھولنے لگا۔ یہاں اب ایک پل بیٹھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ باتھ روم کا بہانہ کر کے میں اٹھ گیا۔ دوسرے کمرے سے ملحقہ باتھ روم کی طرف جانے لگا۔

"حنیف صاحب خیریت"-----

الماس بائی کچھ گھبرا گئی۔

گھاگ کنجری تھی-----

اس نے میرے چہرے کے تاثرات شاید پڑھ لیے تھے۔

"کچھ نہیں -----ذرا باتھ روم تک جا رہا ہوں"-----

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور دوسرے کمرے میں آ گیا۔

"خدا جانے کس طاقت نے اچانک ہی میرے پاؤں پکڑ لیے ----- میں نے باتھ روم کا رخ کرنے کے بجائے اس بھاری پردے کے پیچھے جو ان دونوں کمروں کے درمیان اس وقت دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے دیوار کا کام دے رہا تھا کھڑا ہو کر ان کی گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگا-----

پردہ جدید انداز سے بنایا ہوا تھا اس کی جھالریں زمین پر پڑی تھیں اور غور سے دیکھنے پر بھی دوسری طرف کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

"وے بیڑہ غرق جائے گڈی سائیں ----- کچھ تو حیا کر ----- خبردار باؤ حنیف کے سامنے نوری کے معاملے میں احتیاط کرنا ----- اے نوری پرے مر ----- کس طرح یار کے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہے ----- جا اسے سنبھال ----- خبردار اگر یہ مرغی ہاتھ سے نکلی تو یاد رکھنا تجھے کتوں کے سامنے پھینکوا دوں گی -----"

الماس بائی کی غصیلی آواز نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا -----

"ہائے باجی مجھ پر کیوں ناراض ہو رہی ہیں ----- سائیں نے خود اشارہ کیا تھا ----- میں کوئی اپنی مرضی سے اس سے جڑ کر بیٹھی تھی"-----

نوری بولی-----

"اچھا زیادہ بک بک نہ کر ----- چل اس کمرے میں دفع ہو جا ----- اپنے خصم کو سنبھال۔ اسے خوش کر کے بھیجنا۔ سمجھ گئی ناں اس طرح نہ جانے دینا ----- مجھے ابھی بہت کام لینے ہیں۔ بڑا خاص آدمی ہے -----"

"کچھ زیادہ ہی خاص آدمی تو نہیں بن گیا ----- الماس بائی ذرا سنبھل کے چلنا ----- کہیں نو دن پرانا سو دن"----- گڈی سائیں کی آواز آئی۔

"اچھا اچھا چپ کر ----- زبان کو بند کر لے ----- میرا نقصان نہ کروا دینا -----"

الماس بائی نے قریباً ڈانٹنے کے انداز میں کہا پھر وہ نوری سے مخاطب ہوئی۔

"اب اٹھ جا اس یار کو چھوڑ دے اور اس خصم کی خبر لے"-----

"اچھا باجی۔ بے فکر رہو وہ کہیں بھاگا نہیں جا رہا"-----

اس کے اٹھنے کا احساس ہوا اور میں چیتے کی طرح دبے پاؤں لمبے لمبے ڈگ بھرتا باتھ روم میں جا گھسا۔

میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں-----

یہ ساری باتیں زہر میں بجھے خنجر کی طرح میرے رگ و پے میں اتر گئی تھیں اور مجھے اپنے سارے وجود میں آگ تیرتی محسوس ہو رہی تھی۔

باتھ روم میں لگے شیشے پر ایک نظر ڈالنے سے مجھے اپنے کانوں کی لویں سرخ دکھائی دیں-----

"اف میرے خدایا"

کتنے گھناؤنے لوگ تھے یہ-----

کتنا خطرناک کھیل یہاں کھیلا جا رہا تھا۔

کیسے بھیانک لوگوں میں پھنس گیا تھا میں-----

"ایسی باتیں تو کتابوں اور فلموں کی حد تک سنی اور دیکھی تھیں ----- کیا حقیقی زندگی میں بھی ایسا ممکن ہے؟ میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا-----

یہ تو سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

بمشکل خود کو نارمل کرنے کے دو تین منٹ بعد میں باتھ روم سے باہر آ گیا۔ میں

نے بڑی ہمت سے اپنے چہرے پر منافقانہ مسکراہٹ جمائی تھی کہ حالات کا تقاضا یہی تھا۔ اس مرحلے پر میں ان میں سے کسی پر بھی یہ بات ثابت نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میں ان کی اصلیت جان گیا ہوں-----

یوں لگتا تھا جیسے یہ ٹھگوں کا کوئی گروہ تھا جس کی سربراہ الماس بائی تھی۔

ں باتھ روم سے باہر آیا تو بڑی ہمت سے میں نے خود کو نارمل کر لیا تھا-----

وری میری شکل پر نظر پڑتے ہی نجانے کیوں کچھ گھبرا سی گئی۔ شاید اس نے ں کر لیا تھا کہ میں نے اپنے دلی جذبات کو دبا لیا ہے۔

"اے اللہ! میں تو گھبرا گئی تھی-----"

اس نے میری طرف اک ادائے دلبرانہ سے بڑھتے ہوئے کہا۔

"یوں؟"

ہ اختیار میں نے پوچھ لیا۔

وری بھی الماس بائی کی شاگرد تھی۔ اچانک ہی اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"اۓ حنیف جی ----- جانے مولا علی میں کبھی اپنی مرضی سے اس نامراد گڈی ی کا منہ بھی نہ دیکھوں----- کیا کریں آخر دال روٹی بھی تو چلانی ہے ----- میرے اب کے حالات تمہارے سامنے ہیں اگر ان کے گانے کی کمائی پر بیٹھے رہیں تو ہیں ڈھنگ کی روٹی ہی نہ مل سکے۔ اور گھر میں ہے ہی کون ----- لے دے کر ں ہوں یا میری ماں ----- ہمیں بھی روزانہ تو محفلیں ملتی نہیں۔ مہینے میں ایک ڈی سے کیا مل جاتا ہے ----- الماس بائی کے ہاں نوکری سے ہی دال روٹی چل ہے ----- گڈی سائیں اس کا پیر ہے۔ اس بازار میں اس کی بہت "منتا" ہے -----

الماس بائی کے حکم پر ہی میں نے ایک مرتبہ اس کے سامنے صوفیانہ کلام گایا تھا۔
اب وہ اکثر فرمائش کر دیتا ہے ---- مجھے تو آج تک اس نے کچھ نہیں کہا ---- لیکن
نجانے کیوں ایک ڈر سالگا رہتا ہے ----"

اس نے یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب ہی صوفے پر بٹھالیا۔

مجھے علم تھا کہ اس کے بیان کا آخری حصہ سفید جھوٹ ہے ---- !

میرا اندازہ تھا کہ گڈی سائیں جیسا موذی نوری کو کبھی چھوڑ سکتا ہے۔

لیکن ---- میں نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔

اس طرح یقین کر لینے کی وجہ کچھ اور نہیں صرف اس کی قربت تھی۔

برا ہو باؤ امین کا جس کے گھر میں نے وہ فلم دیکھ لی تھی۔ جب نوری نے اٹھ کر
دروازے کی کنڈی لگائی تو وہ میرے نزدیک اس دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم، سب
سے زیادہ سچی ----

اور سب سے زیادہ خوبصورت عورت بن چکی تھی۔

آج شاید اسے احساس ہوا تھا کہ مبادا یہ شکار ہاتھ سے نکل ہی نہ جائے اس لیے
اس نے مجھے آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا۔

اس نے الماس بائی کے حکم کی تعمیل کی تھی ---- اپنے مستقبل کو محفوظ کیا

یا سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو قابو کرنا چاہا تھا۔

بات جو بھی رہی ہو ---- لیکن ---- اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر میری
جگہ کوئی بہت پارسا کوئی بڑا زاہد، عابد بھی ہوتا تو گرمی جذبات سے موم کی طرح پگھل
جاتا ----

نوری نے اس دن ماہر سرجن کی طرح میری ساری کمزور رگوں کو ایک ایک

کر کے بڑی مہارت سے دبایا۔

اس نے باؤ امین کے گھر دیکھی ہوئی فلم کی ہیروئن کی طرح میرے اندر موجود
حیوان کو مکمل تسکین کا سامان فراہم کیا۔

اور ---- جب آدھے گھنٹے بعد اس نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کی کنڈی کھول کر
حمیدے کو آواز دی اور چائے لانے کو کہا تو میں ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو چکا
تھا ---- آدھا گھنٹہ پہلے میں نے پردے کے پیچھے چھپ کر جو شیطانی کارنامہ سنا تھا ----
ان شیطانوں کی آپس کی جو گفتگو سنی تھی۔

وہ اب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔

میں نے اس کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود زبردستی ہزار ہزار کے روپے کے دو
نوٹ تھما دیے اور یہ بھی کہا کہ آئندہ اسے کبھی پیسوں کی ضرورت پڑی اور اس نے
مجھ سے نہ مانگے تو میں اس سے ناراض ہو جاؤں گا ----

ایسا حاتم طائی اسے کہاں ملتا ----

اس نے بظاہر شرماتے ہوئے دونوں نوٹ بڑی ہوشیاری سے اپنے گریبان میں
چھپا لیے اور سرگوشی میں یہ درخواست بھی کی کہ میں کبھی الماس بائی کو اس بات کی ہوا
بھی نہ لگنے دوں کہ میں نے اسے کوئی پیسہ دیا ہے؟ ----

جہاں تک دوسرے معاملات کا تعلق ہے تو اسکا الماس بائی کو علم ہے ہی ----

چائے کے ساتھ ہی الماس بائی اندر آگئی تھی ----

نوری نے ہم دونوں کے لیے چائے بنائی۔ اس درمیان الماس بائی بڑی شرارتی
اور ہوشیار نظروں سے میرے چہرے کے پس پردہ چھپے دلی جذبات کو پڑھتی رہی ----
اس نے نوری سے بالکل بازاری انداز میں سب کچھ پوچھا اور سنا تھا ----

"باؤ حنیف سے ہماری پکی یاری لگ گئی ہے ---- خبردار مجھے شکایت کا موقعہ نہ

ملے۔ باؤ جی کو خوش رکھنا ہے"

اس نے آنکھ دبا کر نوری کو فحش سا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں گھر واپس لوٹ آیا۔

زندگی کی جس شاہراہ پر میں بدمست گھوڑے کی طرح بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے آگے بڑی گہری اور اندھی کھائی موجود تھی لیکن ہوس کی اندھی پٹی جو میری آنکھوں پر بندھ چکی تھی اس نے مجھے ساون کا اندھا بنا دیا تھا-----

مجھے ہر سو ہرا ہی ہرا دکھائی دے رہا تھا۔

دفتر میں اب میں نے کھل کھلا کر حرام کاری شروع کر دی تھی۔ ہر روز ہزار پانچ سو روپیہ رشوت حاصل کر لینا میرے لیے معمول کی بات بن کر رہ گئی تھی۔

والدین مطمئن تھے کہ صاحبزادہ دن رات محنت کر رہا ہے----- مہینے میں ایک دو مرتبہ میں اپنی ماں کو بھی ہزار پانچ سو روپیہ دے کر حاتم کی قبر پر لات مار دیا کرتا تھا-----

اور بے چاری میری سیدھی سادی ماں ان پیسوں سے میری بہن کا جہیز بناتی رہی-----

میری باقی ساری کمائی نوری کی بھینٹ چڑھ جاتی تھی-----

اس درمیان نوری نے مجھے لذت و ہوس کے جن جہانوں کی سیر کروائی اس کے بعد سے تو گویا میں اس کا بندہ بے دام بن کر رہ گیا تھا-----

آئے روز ہم شہر کے کسی بدنام ہوٹل میں کمرہ بک کروا کر اپنی بدبختی پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے۔

اب اس نے میرے ساتھ گھومنا پھرنا بھی شروع کر دیا تھا----- ہم اکٹھے سنیما میں

بھی جانے لگے تھے۔

میں نے ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی -----

جس کی سواری کبھی میرے گھر والوں کو نصیب نہ ہوئی۔ والد صاحب کو میں کوئی نہ کوئی جھوٹ ضرور گھڑ کر سنا دیتا تھا اور وہ مطمئن ہو جاتے تھے -----

میں بڑی ہوشیاری سے اپنے پتے کھیل رہا تھا ---- استاد رنگی خاں کے گھر میں میری حیثیت اب داماد کی سی ہو گئی تھی۔

نوری کی ماں تو بالکل نائکہ کی طرح میری بلائیں لیتی تھی۔ شاید اپنی بیٹی کے ساتھ اس گھناؤنے کھیل میں وہ بھی برابر کی حصہ دار تھی یا پھر اس کا ماضی بھی اپنی بیٹی سے کچھ مختلف نہیں رہا ہو گا۔

استاد رنگی خان بے چارہ بے بس اور مظلوم آرٹسٹ تھا۔

یہ راجاؤں مہاراجاؤں کا دور تو تھا نہیں جو اس کے فن کو پذیرائی نصیب ہوتی۔ یہاں تو اسے سننے کی مہلت ہی کسی کے پاس نہیں تھی۔

اس نے بھی شاید حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اب زندگی کے دن ہی پورے کر رہا تھا۔

الماس بائی کے کوٹھے پر کیا کچھ ہوتا تھا۔ اس کا علم استاد صاحب سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا تھا آخر وہ اس ڈیرے کا "استاد" تھا -----

لیکن -----

یہ اس کی مجبوری تھی کہ زندگی کے اس سمندر میں جہاں اس کی حیثیت ایک چھوٹی سی مچھلی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ وہ کسی مگرمچھ سے دشمنی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

استاد صاحب کو اپنے نشے پان سے غرض تھی یا پھر اپنے ماضی سے ---- وہ جب

فارغ بیٹھتا اپنے ماضی کا رونا رونے لگتا -----

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ماضی میں بڑے بڑے "میدان" گائے ---- لیکن ---- وہ حال کی تلخیوں کا ادراک کرنے کے باوجود کچھ سامان نہ کر سکا اور اب زندگی کی دوڑ میں اتنا پیچھے رہ گیا تھا کہ اگر اس کے پاس نوری جیسا مضبوط سہارا نہ ہوتا تو کبھی کا قصہ پارینہ بن چکا ہوتا۔

نوری بڑی مضبوط کاٹھی والی عورت کا نام تھا۔

اس نے اپنے مجذوب بھائی، باپ اور ماں سب کا بوجھ اٹھا رکھا تھا اور زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنے کی جو قیمت اسے ادا کرنی پڑتی تھی -----

اس کا اندازہ تب میں بھی نہ لگا سکا -----

مجھے بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ الماس بائی نے اسے "چارہ" بنا کر رکھا ہوا تھا۔ نوری کے خوبصورت جسم کا بہترین استعمال نہ صرف جانتی تھی، بلکہ کر بھی رہی تھی -----

نوری تو اس کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی تھی۔ جہاں وہ میری محبوبہ تھی وہاں نجانے الماس بائی نے اسے اور کتنوں کی داشتہ بنا رکھا تھا۔



اس روز میں معمول کے مطابق نوری کے ساتھ کمپنی باغ کے ایک کونے میں راز و نیاز کی باتوں میں مشغول تھا جب اچانک ہی وہاں ایک قیامت آ گئی -----"

یہ محمد یار کونسلر کا لڑکا جاوید تھا جسے "جیرے میاں" کے نام سے شہر کے آدھے سے زیادہ تھانے والے جانتے تھے -----

خدا جانے اس کمبخت کو مجھ سے کیا دشمنی تھی ---- وہ خود ہیروئن فروخت کرتا تھا اور آئے روز تھانے کچہریوں کے چکر اس کا معمول تھا۔ میرا اس سے دور دور تک

کوئی علاقہ نہیں تھا ----- لیکن ----- اس کی عادت تھی کہ راہ چلتے مجھ پر ایک آدھ فقرہ ضرور اچھالتا۔ میں نے اس کی بات کا جواب کبھی اس لیے نہیں دیا تھا کہ میں اس کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔

وہ بہرحال ایک کونسلر کا بدمعاش بیٹا تھا اور میں ایک غریب مولوی کا بے سہارا بچہ ----- میرا اس کا کیا مقابلہ۔

مجھے اس کی یہاں موجودگی کا علم نہ ہوتا کیونکہ ہمارا منہ دوسری طرف تھا۔

باغ والوں نے اپنے لان میں درختوں کے جھرمٹ میں جو کرسیاں میزیں بچھا رکھی تھیں ہم ان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

اچانک ہی کسی نے مجھے عقب سے مخاطب کیا۔

میں نے گردن گھمائی تو یوں لگا جیسے یکدم بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔

تین چار میزیں درمیان میں خالی تھیں اور ایک کونے میں جیدا بوتل سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ خدا جانے وہ موذی یہاں کیا کرنے آیا تھا۔

بجلی کے اس جھٹکے نے جو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے لگا جیسے میرا سارا جسم کا خون نچوڑ لیا ہو -----

جیدے نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا اور میں سحرزدہ معمول کی طرح اس کے پاس پہنچ گیا۔

"بیٹھ جا" -----

اس نے مجھے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں روبوٹ کی طرح وہاں بیٹھ گیا۔

"اوئے مولوی ----- اوئے تو تو بڑی کتی چیز نکلا ہے اوئے ----- یہ شکار کہاں سے مارا ہے ----- بڑا گرم مال ہے ----- اوئے اکیلے اکیلے ہی موجیں کر رہا ہے -----

اس نے بڑی بے شرمی سے اپنی غلاظت کا مظاہرہ کیا۔

"جاوید صاحب آپ کیا بات کر رہے ہیں" -----

میں نے بمشکل تھوک نگل کر حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اب بات بھی میں ہی بتاؤں ----- باپ وہاں مسجد کمیٹی کا چیئرمین بنا سارے ... کو تبلیغ کرتا پھر رہا ہے اور یہاں صاحبزادہ نوری میراثن کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا ہے" -----

اس کے منہ سے نوری کا نام سن کر میرے رہے سہے پران بھی نکلنے لگے -----

جیدا بڑا پرانا حرام کار تھا -----

میرے رگ و پے میں سرایت خوف جو میرے منہ پر چپک گیا تھا اس کے لیے اب ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اوئے گل سن اوئے مولوی ----- میری بھی نوری پر نظر تھی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ مال تو اپنے گھر ہی میں رہا ناں ----- اوئے گل سن اوئے ----- ہم تیرے پرانے محلے دار ہیں۔ ہمارا حصہ نکلنا چاہیے ----- ہمیں بھی موج میلا کروا دے"

اس نے بالکل اس انداز میں یہ بات کہی جیسے میں نوری کا دلال ہوں اور وہ اس کا گاہک -----

میرا خون کھول اٹھا -----

لیکن ----- ہاں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا ضروری تھا۔

"جاوید صاحب میرا اس سے کوئی ایسا تعلق نہیں جیسا آپ سمجھ رہے ہیں -----

"اچھا تو وہ تیری بہن ہے کیا؟"

اس نے تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ میرے کانوں میں ڈال دیا ہو۔

"جیدے زبان کو لگام دے" -----

میں غصہ سے کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

جواب میں اس نے مجھے دو تین ماں بہن کی گالیاں سنا دیں۔

اب میرے لیے صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے سامنے دھری بوتل اٹھائی اور غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے اس کے سر پر دے ماری

جیدے کے لیے میرا یہ رد عمل ناقابل یقین تھا یہی وجہ تھی کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔

اس کے بعد اس کے ساتھ کیا گزری؟-----

یہ دیکھنے کے لیے میں وہاں نہیں ٹھہرا اور بھاگ کر نوری کے پاس پہنچ گیا۔

"چلو----- چلیں"-----

میں نے خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی نوری کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

وہاں چار پانچ میزوں پر ہی لوگ بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ انہیں صورتحال کی سمجھ آتی میں نے نوری کا ہاتھ پکڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔

نوری میرے ساتھ گھسٹتی چلی آ رہی تھی-----



میرے پیچھے لوگ کیا چلا رہے تھے؟

میں سائیکل سٹینڈ تک کسی طرح پہنچا؟

ان باتوں کا مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ عام حالات میں اگر جیدا مجھے ایک گھونسہ مار دیتا تو شاید میری موت واقع ہو جاتی۔ خدا جانے وہ کون سا لمحہ تھا جو میری سائیکی پر گزرا اور جس نے مجھے ان ساعتوں میں اتنا بہادر بنا دیا کہ میں نے بوتل اٹھا کر اس کے سر میں دے ماری۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے کتنا احمقانہ قدم اٹھایا ہے۔

حیران پریشان نوری کو میں نے پیچھے بٹھایا اور اس سے پہلے کہ باغ کی کنٹین سے دو تین نوجوان جو ہمارے تعاقب میں تھے یہاں پہنچیں میں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی-----

وہ مجھے آوازیں ہی دیتے رہ گئے-----

راستے میں خوفزدہ نوری مجھ سے چپک کر بیٹھ گئی۔ میں نے موٹر سائیکل یہاں سے چلائی تو تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر سیدھا الماس بائی کے ڈیرے پر جا پہنچا۔

ہم دونوں قریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئے تھے----- یہ دروازہ بھی میں نے بڑی گھبراہٹ میں کھولا تھا۔

لیکن----- اندر کا ماحول دیکھ کر دوبارہ گھبرا کر بند کر دیا۔

کمرے میں ایم پی اے خان صاحب اپنے سامنے شراب کی بوتل کھولے بیٹھا تھا اور الماس بائی کے ساتھ بے ہودہ حرکات میں مصروف تھا-----

میں سہم کر دوسرے کمرے میں بیٹھ گیا۔

نوری کے منہ سے ابھی تک خوف کے مارے ڈھنگ کی بات نہیں نکل رہی تھی۔

ہم دونوں ہی پریشان بیٹھے تھے۔

لیکن----- میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور الماس بائی خود کو قدرے سنبھالتی ہوئی وہاں آ گئی۔

"خیریت"-----

اس نے ہمارے چہروں پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر پوچھا۔

"باجی ہمیں بچالو"-----

نوری یہ کہہ کر اس سے لپٹ کر باقاعدہ خوف سے رونے لگی۔

الماس بائی نے اسے چند لمحوں میں ہی نارمل کر لیا---- شاید اس کے رونے کی آواز سن کر دوسرے کمرے سے شراب کے نشے میں دھت ایم پی اے خان صاحب ادھر آ گیا تھا۔

"کیا بات ہے ---- ارے نوری تم ---- تم کیوں رو رہی ہو میری جان ----"

یہ کہتے ہوئے اس نے باقاعدہ نوری کا ہاتھ پکڑ لیا ----

"بیٹھو ---- بیٹھو ---- اطمینان سے بیٹھو"----

الماس بائی نے صورت حال کو سنبھالنا چاہا اور ہم دونوں کو بٹھا دیا۔ نوری کے ساتھ خان صاحب بیٹھا تھا لیکن ---- نجانے کیوں اس لمحے یہ خوف کے مارے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

"حمیدے ----"

الماس بائی نے اپنے نوکر کو آواز دی اور دوسرے ہی لمحے وہ یہاں موجود تھا۔

"بیڑہ غرق جاوی ---- جلدی پانی وانی لے کر آ"----

اس نے نجانے حمیدے کو کیا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی حمیدا دوبارہ ہاتھ میں گلاس پکڑے اندر آ گیا جس میں "کوکا کولا" کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

یہ دو گلاس تھے۔

ایک مجھے مل گیا دوسرا نوری کو ----

حیرت انگیز طور پر اس "بدلے ہوئے ذائقے" والے "کوک" نے حلق سے اترتے ہی میرے کھوئے ہوئے اوسان بحال کر دیے۔

چند لمحوں ہی میں اس "کوک" نے مجھے قائم کر دیا۔

الماس بائی کمال کی ماہر نفسیات تھی ----

اس نے لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیا تھا اور یہی مقصد تھا مجھے عمر بھر کے لیے اپنا بندہ بے دام بنانے کا---- اس نے اس موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مجھے بوتل میں شراب ملا کر پلا دی۔

چند منٹ بعد میں لڑکھڑاتی آواز میں اسے ساری واردات سمجھا رہا تھا----

"جیرے کی ایسی کی تیسی ---- کوئی سالا تمہاری طرف نہیں دیکھ سکتا ---- تم یہیں رہو آرام کرو ---- میں دیکھتا ہوں۔"

خان صاحب نے اس مرتبہ الماس بائی کی بجائے جواب دیا تھا"

اس دوران اس نے ایک کونے میں رکھے ٹیلی فون کے ذریعے پراچہ سے رابطہ کیا اور اسے سارے واقع سے آگاہ کرنے کے بعد ادھر سے کچھ سن کر قہقہہ لگا کر فون رکھ دیا۔

اب چکر سے آنے لگے تھے۔

لیکن ---- ایک عجیب طرح کی طمانیت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ میں نے صوفے پر ڈھیر ہونے سے پہلے آخری منظر یہی دیکھا کہ ایم پی اے خان صاحب نوری سے مستیاں کر رہا تھا اور الماس بائی ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

اس نے بھی خان صاحب کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔



میری آنکھ کھلی تو سر قدرے بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔

الماس بائی میرے بیدار ہونے کے چند منٹ بعد ہی وہاں آ گئی۔

"مطمئن رہو ---- سارا بندوبست ہو گیا ہے ---- ہم نے جیرے کو پیغام بھی پہنچا دیا ہے اور تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری بھی کروالی ہے ---- دراصل اس حرامی نے پولیس رپورٹ لے لی تھی ورنہ خان صاحب پرچہ ہی نہ ہونے دیتے ----"

الماس بائی نے میرے قریباً اوپر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

مجھے الجھن سی ہوئی۔

لیکن ---- میں اتنا خوفزدہ تھا کہ اس کے سامنے اس الجھن کا اظہار بھی کھل کر
کر سکا۔ نوری کوئی بھاگی نہیں جا رہی حنیف باؤ ---- عورتیں ساری ایک جیسی
ہوتی ہیں"-----

اس نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

اور -----

اس فاحشہ نے اپنا خراج وصول کر لیا۔

دوسرے کمرے میں ایم پی اے خان صاحب نے بھی وہی سلوک نوری کے ساتھ
اس کی رضامندی سے کیا تھا۔ میری حالت ایسے موت کے سزا یافتہ قیدی کی سی تھی
جس کی واحد امید الماس بائی سے بندھی ہو ----

یہی وجہ تھی کہ میں اس کے اشاروں پر بندر کی طرح ناچ رہا تھا۔

شام ڈھلے تک میں بالکل نارمل ہو چکا تھا۔

مجھے یہ علم نہیں تھا کہ ان لوگوں نے اس کیس کو کیسے ہینڈل کیا صرف اتنا پتہ چلا
کہ پراچہ نے تمام معاملات کو سنبھال لیا تھا-----

نوری بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ میرے لیے سب سے زیادہ تشفی آمیز بات یہی تھی
اس سے ملنے کے بعد ہی میں رات گئے گھر پہنچا-----

خدا کا شکر تھا کہ گھر پولیس نہیں آئی تھی نہ ہی ابھی تک غنڈوں نے میرے گھر
حملہ کیا تھا۔ اور مطلب یہی تھا کہ جیرے کو ان لوگوں نے قابو کر لیا ہے۔

میں بڑے آرام سے سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں پہنچا تو والد صاحب ابھی
تک جاگ رہے تھے۔ شاید میرے ہی منتظر تھے۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

انہوں نے چھٹتے ہی دریافت کیا۔

"کام سے۔ آپ کو کتنی مرتبہ بتاؤں کہ میں نے پارٹ ٹائم نوکری کی ہوئی
ہے-----"

میں نے بظاہر معمول کا بہانہ کیا۔

"بکواس بند کر ---- ذلیل انسان تو نے میری سفید داڑھی پر گندگی پھینکی ہے ----
گھٹیا آدمی سارے بازار میں تیرے اس میراثن کے ساتھ معاشقے کے چرچے ہو رہے
ہیں -----"

انہوں نے اتنے غصے اور زور سے کہا کہ ان کو کھانسی لگ گئی۔

والدہ اور بہن گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اس درمیان والد صاحب کھانستے کھانستے
چارپائی پر ڈھیر ہو گئے۔ میں نے جب انہیں سہارا دینا چاہا تو انہوں نے پہلے دھکا دے کر
پرے کر دیا اور والدہ اور بہن نے بمشکل انہیں سہارا دے کر بٹھا دیا۔

اس روز مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں شدید بے غیرت ہو چکا ہوں۔ میری
آنکھوں کے سامنے گزشتہ دنوں میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد سے کبھی میری غیرت
نہیں جاگی تھی-----

آج میری آنکھوں کے سامنے نوری نے خان صاحب کے ساتھ رنگ رلیاں
منائی تھیں اور میرے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ حالانکہ مجھے غصے سے پھٹ
جانا چاہیے تھا-----

اور اب جب میرے والد نے مجھے میری واردات سے آگاہ کیا تو بھی مجھے کچھ نہیں
ہوا تھا۔ اس بات کی سمجھ تو مجھے آ گئی تھی کہ کونسلر محمد یار کے لڑکے جیدے نے
سارے بازار کو میرے اور نوری کے معاشقے کی خبر کر دی ہو گی یقیناً مسجد میں کچھ لوگوں

نے والد صاحب کو بھی ان کے "صاحبزادے" کے کارنامے پر شرم دلائی ہو گی-----

لیکن ----- والد کی حالت دیکھ کر بھی میرے دماغ پر سوار فتور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے نوری کی محبت ایک چیلنج کی طرح قبول کر لینی چاہیئے -----

رات دیر گئے میری ماں میری منت سماجت کرتی رہی کہ میں اپنی گندی حرکتوں سے باز آجاؤں۔

لیکن' ----- میں نے نہ صرف یہ کہ اپنا کوئی جرم ماننے سے انکار کر دیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ جیدے نے میرے خلاف جھوٹی الزام تراشی کی ہے۔ کیونکہ میرا اور اس کا جھگڑا ہو گیا تھا-----

تھک ہار کر والدہ بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

ساری رات مجھے نیند نہیں آئی -----

میں کروٹیں بدلتا رہا-----

نوری کی فلم باؤ امین کی فلم کی طرح میری دل و دماغ میں چلتی رہی۔ بجائے اپنے والد کی بات پر شرم کرنے کے جیدے کے لیے میرا خون کھولتا رہا-----

میرا جی چاہتا تھا تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر ابھی جاؤں اور اس کا گلا دبا دوں ----- اس حرامی نے مجھے سارے شہر میں بدنام کر دیا تھا۔

اس میں قصور جیدے کا بھی نہیں تھا!

اس کے اور میرے والدین ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے۔ اگر اس کا باپ معاشرے میں برائی کا سمبل تھا تو میرا باپ نیکی کی علامت-----

والدہ بتایا کرتی تھیں کہ بچپن میں دونوں لدھیانے میں اچھے دوست تھے اور مولوی صاحب کونسلر محمد یار کو اس ناطے سمجھایا کرتے تھے کہ وہ حرام کاری سے باز

رہے اپنی اولاد کو حرام نہ کھلائے ورنہ دنیا ہی اس کے لیے جہنم بن جائے گی۔

کونسلر محمد یار ہمارے گھر عید شب برات پر ضرور آیا کرتا تھا اور والد صاحب کو ایک ہی بات کہتا تھا کہ حرام حلال کا کچھ تعلق اس بات سے نہیں ہوتا۔ جس اولاد نے خراب ہونا ہو وہ ہو ہی جاتی ہے اور جس نے نہ ہونا ہو نہیں ہوتی -----

وہ کہا کرتا تھا مولوی صاحب پیغمبروں کے بیٹے بھی گمراہ ہو گئے تھے اور گمراہوں کی اولاد کو اولیائی مل گئی تھی -----

مجھے آج اس کی باتیں سچ محسوس ہو رہی تھیں -----

میرے والد نے ساری زندگی ہمارے منہ میں حرام کا لقمہ نہیں آنے دیا تھا۔ لیکن ----- میں گمراہ ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا اپنی عادت کے مطابق والد صاحب محمد یار کونسلر اور اس کے لڑکوں پر خوف اور جھجک کی تنقید کر دیا کرتے تھے۔

محمد یار نے تو کبھی اپنے "مولوی یار" کی بات کا برا نہیں منایا تھا۔

لیکن ----- اس کے لڑکوں کے لیے اب یہ سب کچھ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ والد صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں اپنے حال میں مست رہنے دیا کریں ----- "کیوں ----- کیوں رہنے دوں ----- میرے بھتیجے ہیں ----- کل خدا کی عدالت میں کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ اپنا فرض نہ پورا کروں ----- صدیوں سے وہاں لدھیانے میں ہمارے آباؤ اجداد اکٹھے رہتے آئے ہیں ----- یہاں آ کر کیا ہمارا خون پانی ہو جائے گا-----"

وہ ہمیشہ اس سے ملتا جلتا جواب دے دیا کرتے تھے۔

"اچھا بابا جیسی آپ کی مرضی -----

میں یہ کہہ کر جان چھڑا لیتا۔

○ ○

میں سوچ رہا تھا-----

اب جو محمد یار کے لڑکے کو موقع ملا ہے کہ مولوی صاحب کو سربازار ننگا کرے
وہ کیوں نہیں کرے گا۔ وہ تو بھلا ہو الماس بائی کا جس نے مجھے تھانے کچہری اور مار
سے بچا لیا ورنہ وہ موذی اب تک جانے کتنے سود کے ساتھ اپنا قرض وصول کر
ہوتا۔

خدا جانے اسے الماس بائی نے کیا دھمکی دی تھی-----

لیکن----- میری بدنامی سے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔

صبح میں جان بوجھ کر جلدی اٹھا اور معمول سے پہلے ہی سوچا کہ دفتر چلا جاؤں
زیادہ محلے والوں سے واسطہ ہی نہ پڑے

لیکن----- برا ہو دینو پہلوان کا جو ہمیشہ کی طرح میرے راستے میں سر سکندری
کر کھڑا تھا۔

"اور سنا باؤ حنیف----- بھئی بڑا ہاتھ مارا ہے شہزادے----- یار ہمیں بتا
-----وہ تو اپنے سائیں جی کی بڑی پکی مریدنی ہے-----"

دینو پہلوان نے چھٹتے ہی کہا۔

"پہلوان جی آپ کی بڑی مہربانی میرا دماغ پہلے ہی بہت خراب ہے مجھے تنگ
کریں"

میں نے دینو پہلوان سے درخواست کی۔

"اوہ لو بھئی----- بھلے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ اوہ! شہزادے ہم تیرے ہمدرد
یار تیری مدد کرنا چاہتے ہیں اور تو ناراض ہو رہا ہے-----

پہلوان نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کی مہربانی-----"

میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"باؤ حنیف----- شہزادے جب تو کہے اسے یہاں بلالیں----- اوئے اپنے سائیں
کی خاصی مریدنی ہے اور ہاں ایسے نسخے دوں گا کہ ساری زندگی تیری غلام رہے
-----"

میرے کانوں میں گلی کی نکڑ تک پہلوان کی منحوس آوازیں پڑتی رہیں۔

گھر سے دفتر پہنچنے تک جو بھی محلے دار مجھے ملا اسی نے کل کے واقعے کے متعلق
ظہار ضرور کیا جس کا مطلب تھا کہ جیدے نے مجھے محلے میں خاصا بدنام کر دیا ہے

اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا-----

اس نے تو صرف شیدے نائی کی دکان تک یہ "واردات" پہنچائی ہو گی۔ باقی کام
ے نے خود ہی کر لیا ہوا تھا۔

دفتر میں سارا دن میرا خون جوش کھاتا رہا۔

جیدے نے مجھ سے بڑا بھیانک انتقام لیا تھا۔ مجھے علم ہوا کہ اس کے سر میں
ٹانکے لگے تھے۔ اگر وہ چاہتا تو باآسانی اپنا بدلہ لے سکتا تھا۔

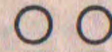
لیکن----- الماس بائی کا حوالہ کام آگیا اور میری جان بچ گئی۔

یہ بات میں بھی کہتا تھا کہ اس کی حالت تلملائے ہوتے زخم خوردہ سانپ جیسی ہو
اور وہ وقت آنے پر ضرور ڈنک مارے گا۔

وہ بھی کوئی عام قسم کا بدمعاش نہیں تھا۔ دو تین محلوں میں تو اس کی ہیروئن عام
تھی۔ مقامی تھانے کو اس کی طرف سے باقاعدہ "ماہانہ" جاتا تھا۔ تھانے میں اس کا
اثر و رسوخ تھا-----

یہ تو میرے سامنے کی باتیں تھیں کہ محلے میں جب کبھی پولیس آئی تو پولیس اور

ملزم کے درمیان دلال کا کردار وہی ادا کیا کرتا تھا-----



شام تک میں وہیں بیٹھا کڑھتا رہا-----

ابھی دفتر سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے پراچہ آتا دکھائی دیا۔ میں جانتا تھا کہ پراچہ ہی کو انہوں نے کام کے لئے رکوایا تھا۔

وہ خاصا بااثر دکھائی دیتا تھا-----

پراچہ سیدھا میری طرف آیا۔ یہ ہماری کوئی دوسری تیسری ملاقات نہیں تھی۔ ہم کئی مرتبہ الماس بائی کے ہاں مل چکے تھے لیکن ----- وہ میرے ساتھ بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا تھا۔

"یار تم فکر نہ کرنا----- مجھے تو جیسے ہی خان صاحب نے فون کیا میں نے تو ارد گرد کے تھانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے کہا اوئے ہمارا بھائی ہے باؤ حنیف خبردار اگر کسی نے اس کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا-----"

اس نے ملتے ہی احسان جتلا دیا۔

"یار تمہارا بہت شکریہ۔ لیکن میرے لیے بڑی پرابلم ہو گئی ہے۔ جیدے نے سارے علاقے میں مجھے بدنام کر دیا ہے۔ تم جانتے ہو میرے گھر والے شریف لوگ ہیں۔ والد صاحب کی صحت پہلے ہی خراب رہتی ہے۔ وہ بڑے پریشان ہیں ----- یار پراچہ میں جیدے کو سبق سکھانا چاہتا ہوں-----

میں نے اپنے پھپھولے پھوڑے-----

"گل ای کوئی نہیں یار ----- تم حکم کرو باؤ حنیف اس کی بدمعاشی کی ایسی کی تیسی وہ کوئی ہم سے بڑا بدمعاش ہے-----"

پراچہ نے مجھے حوصلہ دیا۔

وہ آج پیدل ہی آیا تھا۔ میری موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ہی ہم دونوں ریسٹورنٹ کی طرف چل دیے یہاں پراچہ کی میز ہمیشہ ریزور رہا کرتی تھی۔

پراچہ نے پرتکلف چائے کا آرڈر دے دیا تھا اور ہم دونوں آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ دیکھو حنیف یار ----- ہم دونوں ایک ہی کلاس کے ہیں ----- مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ تم الماس بائی سے پہلے کی طرح یہ بات بھی کرو گے یا نہیں ----- لیکن میرا فرض ہے کہ جب تمہیں دوست کہا ہے تو تمہارے ساتھ دوستی کا حق بھی ادا کروں ----- خان صاحب مرد آدمی ہے ----- اس کے بہت لمبے ہاتھ ہیں۔ الماس بائی کی ساری سکیم ہی یہی ہے کہ وہ خان صاحب کے اور دوسروں کے درمیان واسطہ بنی رہتی ہے ----- میں کہتا ہوں تم خان کے ساتھ "ڈائریکٹ" ہو جاؤ ----- کسی بھی طرح اس کو درمیان سے نکالو۔ جہاں تک نوری کا تعلق ہے ----- تم اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ تم نے اسے خرید لیا ہے وہ الماس بائی کا مال ہے۔ اچھے ہڈ پاؤں کی لڑکی ہے ----- مجلے لگتی ہے اسے الماس بائی کسی بھی جگہ استعمال کر سکتی ہے۔ ----- میرا مطلب ہے کہ تم ہوشیار رہنا-----"

میں جانتا تھا پراچہ میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ نہ ہی اسے میرے باپ کی طرح میری فکر دامن گیر تھی۔ وہ اگر ہمدردی سے بھی بات کر رہا تھا تو بھی اس کا ایک پس منظر تھا-----

وہ خود ایک بڑے اخبار کا کرائم رپورٹر ہونے کے حوالے سے پہنچ والا آدمی تھا اور اسے غصہ اس بات کا رہا ہو گا کہ الماس بائی درمیان میں آ کر اس کے حصے کا خاصا مال ہڑپ کر جاتی تھی-----

لیکن ----- اگر وہ صرف ہمدردی یا خدا خوفی سے بھی مجھے سمجھا رہا تھا تو بھی میں اسے کیسے بتاتا کہ اب ہوشیار رہنا یا نہ رہنا میرے بس کی بات نہیں تھی-----

اب تو میں قدم قدم پر الماس بائی کا دست نگر تھا۔ اس نے نوری سے متعلق مجھے کوئی نئی اطلاع نہیں دی تھی۔

لیکن ---- میں نوری کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی میں باؤلا ہو جاتا تھا ---- میرے تن بدن میں چنگاریاں سلگنے لگتی تھی۔

نوری نے جان بوجھ کر یا انجانے میں مجھے جنسی لذت سے جن جہانوں سے روشناس بہم پہنچادی تھی اس کے بعد تو اسے چھوڑنا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا----

برا ہو باؤ امین کا جس کے گھر میں نے وہ فلم دیکھی تھی ----

میرا ذہن بار بار جیدے کی طرف جا رہا تھا۔ میں چشم تصور سے اس منظر کا احاطہ کر رہا تھا جب میرے شریف والد کو اس نے بازار میں لوگوں کے درمیان روک کر میرے کرتوت سے آگاہ کیا ہو گا۔ حیرت تو اس بات کی تھی کہ وہ کمبخت مرہم پٹی کروا کر سیدھا بازار ہی میں آگیا تھا۔ گھر شاید گیا ہی نہیں تھا۔

یہ تو مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس نے گھر پر تیمار داری کے لیے آنے والوں کو میرے کرتوت اور خود پر گزرنے والے سانحے سے آگاہ کیا تھا۔

"پراچہ یار اس جیدے کا کچھ ہونا چاہیے" ----

میں نے پراچہ سے دل کی بات کہہ دی۔

"کوئی بات ہی نہیں ---- حنیف باؤ تم بے فکر ہو جاؤ یار ---- اچھا یار میں دراصل ایک کام سے تمہارے پاس آیا تھا---- یار ان سے کام ہے----

یہ کہتے ہوئے اس نے بھی دفتر کا ایک کام بھی بتا دیا۔

مجھے اس پر کوئی تعجب نہ ہوا کیونکہ یہ دنیا تو اس ہاتھ دو اور اس ہاتھ لو کے اصول پر قائم ہے میں کوئی مریخ کا باشندہ تو نہیں تھا کہ میرے ساتھ کوئی اور قسم کے رولز اینڈ ریگولیشن اپنائے جاتے۔

"ٹھیک ہے' پراچہ صاحب کل آپ کا کام ہو جائے گا ---- لیکن جیدے کا کام ابھی نہیں کرنا۔ ابھی وہ ٹھیک ہی ہے ---- پراچہ مجھے اپنی بے عزتی کا افسوس نہیں میں کوئی ایسا عزت دار آدمی بھی نہیں ہوں۔ لیکن ---- میرے باپ نے ساری زندگی محنت کر کے عزت کے علاوہ کمایا ہی کیا تھا اس کی تو ساری زندگی کی کمائی چھن گئی ہے"

نجانے کیوں یہ بات کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔

یار باؤ حنیف تو ہمارا بھائی ہے ---- اس کی ایسی کی تیسی۔ ایسا بندوبست کرواؤں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا" ----

پراچہ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بالآخر ہم اگلے روز الماس بائی کے ہاں ملنے کا وعدہ کر کے الگ ہو گئے۔



میں بازار سے چوروں کی طرح موٹر سائیکل تیزی سے چلاتا گھر پہنچا اور سوچا کہ منحوس پہلوان کی نظروں سے بچ کر اوپر چلا جاؤں گا لیکن اس کمبخت کی تو ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کی طرح نجانے کتنی آنکھیں تھیں۔

ابھی میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا ہی تھا کہ پہلوان کی آواز سنائی دی۔

"حنیفے باؤ----"

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق پاؤں پٹختا اس کے پاس چلا گیا۔

"کیا بات ہے؟"

میں نے پہلوان سے پھاڑ کھانے والے لہجے میں دریافت کیا جو اپنی مونچھوں پر شاید تیل لگا رہا تھا "یار کبھی ہم سے سیدھے منہ بھی بات کریں کہ ---- تمہارے بھلے

کی بات ہے شہزادے ----- آج دوپہر کو تھانے سے ایک سپاہی آیا تھا تمہارا پوچھنے کو
----- اور وہ تو اچھا ہوا کہ مولوی صاحب گھر پر نہیں تھے----- شریف آدمی ہیں بے
چارے خواہ مخواہ پریشان ہوتے تم بے فکر رہو شہزادے میں نے سنبھال لیا تھا اسے
----- اوئے میں نے کہا خانہ خراب کی اولاد تجھے باؤ حنیف کا علم نہیں وہ ڈی سی آفس
میں آفیسر لگا ہوا ہے ----- تیری پیٹی اتروا دے گا-----"

پہلوان نے مونچھوں پر الٹے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے تو میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ-----

میں نے بظاہر لاپرواہی سے پہلوان سے پوچھا۔

"اوئے کیا کہنا تھا----- اپنے نمبر بنانے آیا تھا۔ چار پیسے مانگنے آیا ہو گا----- پرچہ تو
کوئی ہوا نہیں ----- اس شہزادے تو نے کمال کر دیا یار ----- جیدے کو چارپائی پر لٹا دیا
----- بڑا بدمعاش بنا ہوا تھا سالا-----"

پہلوان نے اسے ماں کی موٹی سی گالی دے کر کہا۔

مجھے علم تھا جب جیدا کبھی اس کے سامنے آئے گا تو یہ موذی مجھے اس سے بڑی
اور زیادہ گالیاں دے کر میرے لئے بھی فقرہ اسے سنائے گا"

لیکن جب فی الوقت مجھے پولیس کی فکر دامن گیر تھی اگر میری ماں کے سامنے ہی
پولیس آگئی تو وہ بے چاری تو خوف ہی سے مرجائے گی-----

"آپ نے اس کا نام پوچھا تھا"-----

میں نے اچانک ہی پہلوان سے پوچھا پہلے تو اس موذی کی زبان بند کرنا ضروری ہو
گیا تھا۔

"یار حنیف باؤ ----- شہزادے اس کی ضرورت ہی نہیں۔ اوئے ہمارے ہوتے

اوئے کس کی مجال ہے جو تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھے ----- شہزادے گڈی
سائیں کوئی معمولی مٹی نہیں ہے۔ شہر کے بڑے بڑے افسر اس کے مرید ہیں"-----

پہلوان نے اپنی آنکھ دبا کر کہا۔

دینو پہلوان صاحب مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اب اگر کوئی پولیس والا
آئے تو تم اس کا پیٹی نمبر نوٹ کر لینا۔ آج کل میں ڈی سی صاحب کا سیکرٹری لگ گیا
ہوں ----- جس تھانے کو فون کروں گا وہ میرے احکامات اس طرح مانیں گے جیسے ڈی
سی صاحب کے مانتے ہیں"-----

میں نے پہلوان کی کمزور رگ دبائی۔

"اوئے خیر اے یار خیر اے ----- شہزادے بے فکر ہو جا----- جب تیرا دل چاہے
اری سے ملنے کو مجھے بتا دینا----- گڈی سائیں کا حکم ملتے ہی اڑتی چلی آئے گی"-----

اس نے آخری فقرہ قدرے آہستگی سے اور رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔

نہ جانے مجھ پر اچانک کیا دورہ پڑا-----

میں تو پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔ میں نے پہلوان کے سامنے اس کے گڈی سائیں
کو تین چار گالیاں سنا دیں۔

دینو پہلوان نے ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے میرا چہرہ دیکھتا رہا اور میں سیڑھیاں
چڑھ کر اوپر چڑھ گیا۔

"گھر کو تالا لگا تھا-----

اس کا مطلب یہ تھا کہ والدہ کسی کام سے گئی ہیں اور چابی نیچے دے گئی ہوں گی۔
اس سے پہلے کہ میں پہلوان کے گھر والوں کو آواز دے کر چابی سے متعلق دریافت
کروں مجھے عابدہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتی دکھائی دی۔

اس کے ہاتھ میں چابی پکڑی ہوئی تھی-----

اس نے کچھ کہے بغیر چابی مجھے تھمادی۔

ایک لمحے کے لیے میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو مجھے دکھ سا لگا۔ اس کے چہرے پر خلاف معمول یاسیت چھلک رہی تھی۔ میں نے خلاف معمول اس لیے کہا کہ معمول کے مطابق وہ ہمیشہ ہنستی مسکراتی اور عموماً اپنے ہونٹوں پر سرخی وغیرہ چپکا رکھتی تھی ---- لیکن ---- آج وہ بڑی سادہ سادہ اور کسی پرانی بلیک اینڈ وائیٹ قسم کی فلم کی ہیروئن دکھائی دے رہی تھی۔

میں جانتا تھا اسے اس حالت تک پہنچانے کا کسی نہ کسی حد تک میں ہی ذمہ دار ہوں لیکن میں خود کو بری الذمہ اس لیے سمجھتا تھا کہ یہ اس کے یک طرفہ جذبات ہیں اور محبت کی یک طرفہ ٹریفک کوئی اہمیت نہیں رکھتی ----

"عابدہ تم ٹھیک تو ہو ناں ----"

بے اختیار میں نے پوچھ لیا۔

"ہاں ---- بے فکر رہو۔ میں مر نہیں چلی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا جس راستے پر تم چل نکلے ہو وہ تمہیں ضرور تباہی کی طرف لے جائے گا ---- حنیف تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری محبت سے جلتی ہوں ---- یا خدانخواستہ کوئی حسد کروں گی ---- لیکن تم اتنے گر جاؤ گے اس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں تو ایک برے آدمی کی بیٹی ہوں۔ میں تو گڈی سائیں کے چنگل میں پھنس سکتی ہوں ---- لیکن تم مولوی صاحب کے بیٹے ہو کر اس میراثن سے جو گلی گلی میں اپنی آواز اور جسم کا سودا کرتی پھرتی ہے ---- تم اس سے عشق لڑاؤ گے ---- حنیف میں جانتی ہوں کہ گڈی سائیں جیسے غلیظ آدمی سے اس کے ایک عرصے سے ناجائز تعلقات ہیں ---- لیکن تمہیں کیا تمہارے دماغ پر تو اس کا بھوت سوار ہو چکا ہے ---- میں کہتی ہوں حنیف اب بھی سنبھل جاؤ ---- تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تباہی کے غار کی طرف بڑھ رہے ہو ---- تم عزت دار

ک ہو مولوی صاحب کی سارا محلہ عزت کرتا ہے ---- یاد رکھنا اگر تم نے اپنے شریف ماں باپ کو اس طرح ذلیل کروایا تو خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا" ----

اس کی آواز یہ کہتے ہوئے بھرا گئی ---- شاید اس سے زیادہ کچھ کہنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

وہ روتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی ----

میں نے دروازہ کھولا اور کمرے میں رکھی چارپائی پر بے دم سا ہو کر گر پڑا ----

نجانے کیوں عابدہ کی باتوں نے میرے دل پر خاصا اثر کیا تھا ---- مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کسی جذبہ حسد سے نہیں بلکہ میری ہمدردی میں یہ بات کہی ہے ---- مجھے حیرت اس بات پہ ہو رہی تھی کہ جیدے نے کس چالاکی سے محلے کے بچے بچے تک میری رسوائی کو پہنچا دیا تھا ----

اس نے مجھے اور میرے والدین کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی ---- عابدہ کی باتوں سے تو میں کیا نصیحت پکڑتا۔

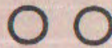
میرے دل و دماغ پر جیدے کی اس غلیظ حرکت سے پیدا ہونے والے غصے اور نفرت نے قبضہ جما لیا۔

میرا بس نہیں چلتا تھا کہ ابھی اٹھوں اور جا کر اس کا ٹینٹوا دبا دوں ---- بجائے اس کے کہ میں اس کی حرکت پر ندامت محسوس کرتا کہ زمانے بھر کی گری ہوئی جسم فروش عورت سے میں نے تعلقات استوار کر کے اپنے باپ کی ساری زندگی کی کمائی ہوئی شرافت اور عزت کو مٹی میں ملا دیا ہے ----

مجھے اس وقت صرف ایک ہی بات سوجھ رہی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہے میں جیدے کو جان سے مار ڈالوں جس نے مجھے اور "بے چاری نوری" کو بدنام کر دیا تھا۔ دینو پہلوان اور عابدہ کو اس بات کا علم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ داری کو بھی یہ

بات معلوم تھی اور پہلوان کی بیوی کے کانوں تک کوئی ایسی بات پہنچ کر اس تک محدود
رہے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا-----
اس نے تو مرچ مصالحے لگا کر میرا یہ کارنامہ محلے کی ایک ایک گلی اور ایک ایک
گھر تک پہنچا دیا ہو گا۔
مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی-----
اور تو کچھ نہ سوجھا میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا چپ چاپ سیڑھیاں اتر گیا۔
سامنے والدہ اور بہن آ رہی تھیں۔
"کہاں چلے ہو؟"-----
والدہ نے بے چینی سے پوچھا۔
"ذرا بازار تک-----ابھی آیا"-----
یہ کہہ کر ان کی کوئی بات سنے بغیر میں آگے بڑھ گیا۔
محلے والوں کی زبانوں کے کوڑے اپنے ضمیر پر کھانے سے بچنے کے لیے میں نے
وہی طویل راستہ اختیار کیا جو میرا معمول تھا اندر چوروں کی طرح چھپا چھپا تھا الماس بائی
کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔
یہاں استاد رنگی خان پنکی کو تعلیم دے دیا تھا-----
"جی آیا نوں-----جی آیاں نوں-----امی آج صبح سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں
-----فون بھی کیا تھا دفتر-----آپ کا فون کیا خراب ہے مل نہیں رہا تھا-----"
پنکی نے میری شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔
"اچھا-----چلو میں خود ہی آگیا ہوں-----"
یہ کہہ کر میں وہیں قریب ہی قالین پر بیٹھ گیا۔
استاد رنگی خان نے شاید نشہ کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بمشکل ہی کھل رہی تھیں

اور وہ نیم خوابیدہ سا دکھائی دے رہا تھا-----
"استاد جی-----زیادہ دیر نہ لگایا کرو-----"تعلیم" کا ہرج ہوتا ہے"-----
حمیدے نے اندر آتے ہوئے کہا۔
"اوئے یار میں تو بازار جا کر پھنس ہی گیا-----آج تو تو کانے خاں نے زبردستی دو
تین گلاس پلا دیے"-----
استاد رنگی خان نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔
پنکی اور حمیدا استاد رنگی خاں کا مذاق اڑانے لگے جو اب دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا
جا رہا تھا-----
میں کمرے کے ایک کونے میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے الماس بائی کا انتظار کرنے
لگا جو کسی کام سے بازار گئی ہوئی تھی۔



تھوڑی دیر بعد الماس بائی واپس آ گئی-----سیڑھیوں ہی سے اس کی گالیوں کی
آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ اس کا معمول تھا اور گھر سے جاتے اور داخل ہوتے وقت
ضرور کسی کو گالیاں دیا کرتی تھی۔
"بسم اللہ-----میں صدقے جاواں-----"
اس کا موڈ میری شکل پر نظر پڑتے ہی بدل گیا۔
"وے مرے-----وے مرجائیں باؤ حنیف کو چائے وغیرہ پلائی ہے یا نہیں-----"
اس نے نوکر کو حسب روایت گالی دے کر پوچھا۔
"بی بی جی ابھی لوٹا ہوں-----"
حمیدے نے کہا اور الماس بائی اسے گالیاں دینے لگی کہ اس نے ابھی تک میری

خاطر تواضع کیوں شروع نہیں کی۔

"وے بیڑہ غرق جاوی جا پہلے باؤ جی کو بوتل پلا لا کر-----"

اس نے حمیدے کی طرف دیکھ کر آنکھ سے اشارہ کیا۔

"حاضر ہوا بی بی-----ابھی حاضر ہوا-----"

یہ کہہ کر وہ مردود چلا گیا۔

بمشکل دو تین منٹ بعد اس کی واپسی ہو گئی۔ اس درمیان الماس بائی مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی تھی اور میری خیریت دریافت کرتی رہی-----

اس کا خیریت دریافت کرنے کا انداز بڑا "جارحانہ" ہو رہا تھا-----

لیکن-----میں بے بس تھا-----

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح میں خود اپنے ساتھ بھی زیادتی کر رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا-----

حمیدے نے گلاس لا کر رکھ دیے جن میں بظاہر "کوک" موجود تھا۔ ایک گلاس الماس بائی نے اٹھا لیا اور دوسرا مجھے تھما دیا۔

آج پھر اسی بوتل کا ذائقہ مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے الماس بائی کو اس کی نشاندہی کی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"پی جاؤ میری جان----- پہلے پہلے ایسے ہی لگتا ہے----- اس کا مزہ پینے کے بعد آئے گا"-----

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

جیسے ہی گلاس میرے حلق سے نیچے اترا۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ضمیر کی خلش جانے کہاں ہوا ہو گئی تھی۔ اب میرے ذہن پر صرف الماس بائی کا قرب غالب ہونے لگا تھا۔ میرے دل و دماغ پر مستی سی چھانے لگی تھی۔ ایک سرور سا

میرے سارے وجود میں پھیل رہا تھا۔ پھر اچانک ہی مجھے الماس بائی دنیا کی سب سے خوبصورت عورت محسوس ہونے لگی۔

میرے دل و دماغ میں باؤ امین کے گھر والی فلم چل پڑی----- اب اس کی ہیروئن الماس بائی بن گئی تھی-----

الماس بائی نے مجھے گناہوں کی جس دلدل میں دھکیلا میں اس میں بہت گہرا اترتا چلا جا رہا تھا۔

آٹھ دس روز اس کے ہاں مسلسل آنے جانے کے بعد اب شراب اور عورت میری کمزوری بن گئی تھی اور یہی وہ چاہتی تھی ---- حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی نوری میرے دل و دماغ سے نہیں اتری تھی۔

خدا جانے اس نے کون سا اسم اعظم مجھ پر پڑھ کر پھونکا تھا کہ میں خارش زدہ کتے کی طرح اس کے گرد ہی چکر کاٹ رہا تھا۔

محلے والوں نے مجھ پر اٹھتے بیٹھتے طنز شروع کر دیے تھے۔ لیکن ---- مجھے اس کی پرواہ ہی کب تھی۔ البتہ ایک بات انہیں سمجھ آ گئی تھی کہ اگر میں جیدے کا سر پھاڑ سکتا ہوں تو انہیں میں معاف نہیں کروں گا۔ اس سے وہ ایک حد سے آگے نہیں جاتے تھے -----

اس روز بھی معمول کے مطابق میں نے نوری سے منہ کالا کیا وہ کمرے سے گئی تو الماس بائی اندر آ گئی۔

"حنیف باؤ ایک بہت ضروری کام آن پڑا ہے"-----

اس نے میرے غلیظ وجود پر چٹکی لے کر کہا۔

"حکم کریں"-----

میں نے خاندانی نوکروں کے انداز میں پوچھا۔

"تمہارے ایک افسر ہیں جعفری صاحب-----"

"ہاں ہیں-----

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ان کی میز سے ایک فائل غائب کرنی ہے"-----

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ تو دوسرے سیکشن-----

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا جعفری صاحب بڑے سخت گیر اور ایماندار آفیسر تھے اور ان کی دسترس سے کوئی چیز نکالنا ناممکن سی بات تھی۔

"ہائے اللہ! حنیف باؤ تیرے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کمال ہے تمہارے منہ سے ایسی بات نہیں نکلنی چاہیئے تھی"-----

اس نے بڑے نخرے سے روٹھ جانے والے انداز میں کہا۔

"الماس بائی ---- میں تمہارے حکم کا غلام ہوں ---- لیکن یقین کرو یہ بڑا مشکل کام ہے"-----

میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"مولا خیر کرے ---- میں نے اپنے حنیف باؤ سے آسان کام تو لینا ہی نہیں-----"

اس نے مجھے بڑے بے ہودہ انداز میں آنکھ مار کر کہا۔

میں نے پھر اپنی مجبوری بتائی اور اسے سمجھانا چاہا کہ واقعی جعفری صاحب کی میز

سے کوئی فائل اڑانا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

"دیکھو باؤ حنیف ----- یہ جو سارا موج میلہ چل رہا ہے ناں ----- یہ خان صاحب کے دم قدم سے ہے۔ ان کا حکم تو ہر حال میں پورا کرنا پڑے گا ---- اگر تم یہ کام نہیں کرو گے تو وہ خانہ خراب پرچہ کر لے گا ---- لیکن اب جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا"-----

اس نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کیا"؟

میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"خان صاحب کی ناراضگی ----- اور ہم اس کی قیمت نہیں ادا کر سکتے ----- تم جیدے کو معمولی بدمعاش نہ سمجھنا۔ بڑے بڑے افسروں کو وہ "منتھلی" دیتا ہے ----- یوں ہی اس کا ہیروئن کا دھندہ نہیں چل رہا ---- اگر اس نے تمہارے خلاف چپ سادھ لی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ خاموش ہی رہے گا ---- تم پر پرچہ کروایا ہوا ہے اس نے ----- دعائیں دو خان صاحب کو ----- اور مولا خیر کرے کبھی بھول کر بھی ان کے کسی کام کو "ناں" نہیں کرنی ----- ورنہ برباد ہو جاؤ گے ----- رل جاؤ گے ----- ساری زندگی کے لیے مارے جاؤ گے"-----

الماس بائی جب یہ باتیں کر رہی تھی تو وہ مجھے ایک مکمل بدلی ہوئی عورت محسوس ہو رہی تھی-----

اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کوڑوں کی طرح میرے دل و دماغ پر ضربات لگا رہے تھے۔ ایک بے نام سا خوف میری رگ و پے میں سرایت کرنے لگا تھا ---- میں یوں پرانی تاریخ کے غلاموں کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ غائب اور آقاؤں کی طرح ہاتھ میں کوڑا پکڑے مجھ سے اپنے احکامات کی تعمیل چاہتی تھی-----

اس بات میں شک بھی تھا-----

اس نے مجھے خرید ہی تو لیا تھا ---- میں نے اپنی مرضی سے اپنے آپ کو غلاموں کی اس منڈی میں بکنے کے لیے پیش کیا تھا۔

اپنے گلے میں "برائے فروخت" کی تختی میں نے خود لٹکائی تھی-----

اور -----

الماس بائی نے میری قیمت ادا کی تھی -----

اس نے میری دانست میں میری اوقات سے بڑھ کر میری قیمت چکائی تھی اب وہ کیسے برداشت کرتی کہ میں اس کے احکامات کی سرتابی کروں -----

"م م میرا مطلب یہ نہیں تھا بائی جی -----"

میں نے فوراً منافقت کا سہارا لیا -----

"بس تمہارا جو بھی مطلب تھا ---- میں نے تمہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے دیکھو باؤ حنیف ہم کنجر لوگ ضرور ہیں لیکن ----- بیوپار کے کھرے ہیں ----- اس بازار میں کچھ مفت نہیں ملتا ---- یہاں آنے والے چند منٹ یا ایک دو گھنٹوں کی صحبت کی بھی فیس ادا کرتے ہیں۔ تم یہ کبھی نہ سوچنا کہ تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے ---- میں کوئی معمولی طوائف نہیں ایک رات میں ہزاروں کھانے والی ہوں۔ اس شہر میں آج بھی میرے سینکڑوں چاہنے والے گاہک موجود ہیں ----- لیکن ----- میں نے تمہیں ہمیشہ مفت عیش کروائی ہے ----- نوری استاد رنگی خان کی بیٹی ضرور ہو گی ----- لیکن اس کوٹھے پر آنے کے بعد یہاں کوئی کسی کی ماں بیٹی یا بہو نہیں رہتی ----- وہ مالکوں کا مال ہوتی ہے ---- میں نے تم سے کبھی اس کے ساتھ گزرنے والے وقت کی قیمت نہیں مانگی ----- اور تم جو کام کرتے ہو اس کا مول الگ چکاتی ہوں ----- میں تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں ---- آج کے بعد تمہیں جو بھی کہا جائے اس سے کبھی انکار

نہ کرنا----- اگر دل نہ مانے تو میری طرف سے کوئی پابندی نہیں جس راستے سے آئے ہو واپس چلے جاؤ ----- لیکن ----- یہ تصور بھی نہ کرنا کہ زندگی میں کبھی دوبارہ نوری کی شکل بھی دیکھ سکو گے"-----

اس نے مجھے صاف وارننگ دے دی۔

آج وہ مکمل طوائف دکھائی دے رہی تھی۔

ایک لمحے میں اس نے اپنی آنکھیں ماتھے پر سجالی تھیں۔

اور میں -----

میں اسی روز دنیا کا سب سے بڑا بے غیرت بن گیا۔

سدھائے ہوئے کتے بھی اپنے مالکوں کے قدموں میں اسطرح لوٹتے جس طرح میں نے بے شرموں کی طرح اس کے بازو اور شانے دبا کر اس کو منانا شروع کر دیا تھا۔

اپنی فتح پر سرشار طوائف کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی تھی۔

"ٹھیک ہے ----- ٹھیک ہے -----"

اس نے میری طرف دیکھ کر بڑی بے نیازی سے کہا۔



گھر میں میرا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا-----

والد صاحب نے تو مجھ سے گفتگو بھی بند کر دی تھی۔ انہوں نے شاید کہیں نوکری کر لی تھی۔ کسی پرائیویٹ فرم میں معمولی سی ملازمت کر کے وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو "حلال" کھلانے پر تل گئے تھے -----

میری والدہ کو انہوں نے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ میری سرکاری تنخواہ سے ایک پیسہ بھی زائد مجھ سے وصول نہ کرے۔

"امی! تم کیوں نہیں سمجھتی ----- باؤ جی کا وقت اب نہیں رہا----- وہ زمانہ نہیں

را۔ باجی کا جہیز کہاں سے تیار کریں گے"-----

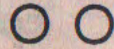
میں اپنی ماں سے کہتا-----

"بیٹا----- میں نے ساری زندگی ایسے ہی گزاری ہے ----- اللہ کوئی وسیلہ کر دے گا۔ بیٹیاں اللہ کا مال ہوتی ہیں ----- پھر ہمارے باؤ جی نے اپنی گریجوئٹی بھی تو جوں کی توں رکھی ہوئی ہے ----- ہائے بے چارے مولوی صاحب ساری زندگی حج کے لیے ترستے رہے ----- کہتے تھے ریٹائرمنٹ سے پیسے ملیں گے تو حج کریں گے ----- لیکن ----- اللہ کو منظور ہو گا ----- بیٹا تم میری اولاد ہو ----- ہماری سنتان ہو ----- لیکن ----- تمہارے باؤ جی کی ساری زندگی کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے دھری ہے ----- انہوں نے کبھی میرے یا کسی اور کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ ساری زندگی رزق حلال کما کر تمہارے منہ میں ڈالا ----- خدا جانے مجھ نمانی سے کیا غلطی ہو گئی۔ اللہ رسول مجھے معاف کر دے ----- بیٹا یہ میرے ہی کسی گناہ کی سزا ہو گی تمہارے بابو جی نے میری ہوش میں کوئی گناہ نہیں کیا-----"

اس کی آواز بھرا جاتی -----

بوڑھی عورت اپنے دامن پر بکھرے ململ کے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ کر برتن یا کپڑے دھونے میں مصروف ہو جاتی۔

تھوڑی دیر کے لیے میرے دل پر اثر ہوتا پھر شیطان مجھ پر غالب آجاتا۔



جعفری صاحب ہمارے محکمے کے بڑے سخت گیر اور بااصول آفیسر تھے-----

مجھے اکثر ان کے کمرے میں آنے جانے کا مسئلہ رہتا تھا----- ٹائپسٹ کی حیثیت سے میرا رابطہ قریباً تمام افسران سے رہتا تھا-----

لیکن ----- میری یہ خواہش رہتی تھی کہ وہ مجھے نہ بلائیں تو بہتر ہے -----

الماس بائی کے چنگل میں جس بری طرح میں پھنس گیا تھا اس کے بعد مجھے بہر صورت فائل حاصل کرنی تھی-----

ان لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے تھے-----

کمبخت نے فائل کا نمبر اور ریفرنس تک مجھے بتا دیا تھا۔ جس کا یہ مطلب بھی تھا کہ اس دفتر میں کوئی اور بھی ان کے لیے کام کر رہا ہے-----

میں دفتر گیا تو پہنچا تو بڑا پریشان اور کسی حد تک خوف زدہ بھی تھا۔ معمول کے مطابق تھوڑی دیر بعد جعفری صاحب نے مجھے طلب کیا۔ شاید کچھ ٹائپ وغیرہ کے لیے دینا چاہتے تھے۔

میں نے اگلے روز ان کی طرف سے ملنے والا خط جو ٹائپ کیا ہوا تھا۔ اس نے دفتری اصول کے مطابق فائل کور میں رکھا اور ان کے سامنے پیش کرنے چلا گیا۔

جعفری صاحب کی میز پر تین چار فائلیں اور بے شمار کاغذ دھرے تھے----- انہوں نے میرے سلام کا سر کے اشارے سے جواب دے کر ایک نظر اس خط پر ڈالی جو ٹائپ کروایا تھا-----

"یار----- اسے ذرا تبدیل کر دو-----"

یہ کہہ کر انہوں نے اس خط میں کچھ ترمیم اضافہ شروع کر دیا۔

اچانک ان کے انٹرکام کی گھنٹی بجی تھی-----

"یس سر! جی سر! ابھی آتا ہوں سر!"

انہوں نے فون پر ہیلو کرتے ہی کہا۔ شاید ڈی سی صاحب نے بلایا تھا۔

"دو منٹ بیٹھنا یار۔ میں ابھی آیا"-----

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے سامنے پھیلے کاغذات کے ڈھیر میں سے ایک پلندہ اٹھایا اور اپنی عینک سنبھالتے باہر نکل گئے۔

ان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"حنیف باؤ----- ایسا موقع زندگی بھر دوبارہ نہیں ملے گا"-----

شیطان نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں لرزتے قدموں سے اٹھا اور کپکپاتے ہاتھوں سے فائلوں کے ریفرنس پڑھنے لگا۔ تیسری فائل وہی نیلے رنگ والی تھی جو مجھے حاصل کرنی تھی-----

خدا جانے مجھ میں اس لمحے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی میں نے اپنے ہاتھ والا نیلے رنگ کا فائل کور وہاں رکھا اور وہ فائل اٹھا لی-----

ابھی میں بمشکل اس کرسی تک ہی پہنچا تھا جس پر عموماً بیٹھا کرتا تھا کہ اچانک ہی دروازہ کھلا اور جعفری صاحب اندر داخل ہوئے۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔

"یار----- میں تھوڑی دیر بعد بلا لوں گا----- ابھی تم جاؤ"-----

شاید کوئی ایمرجنسی آ گئی تھی۔ انہوں نے میری شکل پر نظر ڈالے بغیر کہا۔ یوں تو جعفری حسب معمول کے مطابق ہی بہت مصروف رہا کرتے تھے----- لیکن----- اس وقت کچھ زیادہ ہی مصروف دکھائی دے رہے تھے۔

خدا کا شکر ہے انہوں نے میری شکل پر نظر نہیں ڈالی۔ ورنہ میرا خون سے نچڑا ہوا زرد چہرہ ضرور انہیں شک میں مبتلا کر دیتا۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور باہر آ گیا----- تین چار لمبے لمبے سانس لے کر میں نے خود کو نارمل کیا اور اپنے کمرے کی طرف جانے کے بجائے دفتر سے باہر آ گیا-----



مجھے اب فوراً اس مصیبت سے نجات حاصل کرنا تھی اور فائل کو الماس بائی تک پہنچانا تھا۔ دفتر کے باہر موجود ایک پی سی او سے میں نے الماس بائی کو فون کیا اور اسے

کہا کہ فوراً کسی کو بھیج کر فائل وصول کر لے-----

الماس بائی نے میرے اضطراب کی شدت اور معاملے کی نوعیت کا نوٹس لیا۔

میں وہیں کنٹین پر چائے پینے کے بہانے بیٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ چائے کا ذائقہ اتنا تلخ محسوس ہو رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے میرے حلق میں چائے کے بجائے تیزاب گر رہا ہے۔ یہ تیزاب حلق سے معدے میں اتر کر میری سارے جسم کو اندر کاٹتا چلا جا رہا تھا اور اس زہر کی تلخی میرے خون میں گھل کر سارے جسم میں دوڑنے لگی تھی۔

خدا جانے الماس بائی نے کس کو فون کیا۔ بمشکل چار منٹ بعد ہی مجھے ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔ خان صاحب کا ڈرائیور تھا اور کبھی کبھی ان کے ساتھ الماس بائی کے کوٹھے پر بھی آجایا کرتا تھا۔ میرے ساتھ نظریں ٹکراتے ہی وہ تیر کی طرح سیدھا میری طرف آیا اور میں نے کچھ کہے سنے بغیر فائل اسے تھما دی۔

ایک مرتبہ پھر دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں سے میں اپنی میز تک پہنچا اور چوروں کی طرح سر جھکا کر بظاہر کام میں مصروف ہو گیا۔

میرا دل خزاں زدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا-----

دوپہر کو کھانے کے بہانے میں دوبارہ باہر آگیا----- خدا خدا کر کے وہ دن کٹا اور دفتر کے اوقات ختم ہوتے ہی آدھا گھنٹہ پہلے میں گھر آگیا۔

گھر آکر میں بے سدھ سا ہو کر بستر پر گر پڑا----- ابھی تک میرے اوسان صحیح معنوں میں بحال نہیں ہوئے تھے۔

میں حیران ہو رہا تھا کہ کس طلسماتی قوت نے میرے ہاتھ یہ کارنامہ انجام دلوایا ہے۔ جعفری صاحب جیسے سخت گیر اور با اصول آفیسر کی میز سے اس طرح دن دہاڑے ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فائل غائب کر دینا عام حالات میں ناممکن سی بات

شام تک میں اسی طرح سوچوں میں گم صم لیٹا رہا-----

شام کے بعد میں اٹھا اور حسب سابق طویل راستہ اختیار کر کے الماس بائی کے ے پر پہنچ گیا۔

"جی آیاں نوں ---- جی آیاں نوں ---- جیو میرے باؤ صاحب یار تم نے تو کمال ہی کر دیا ---- واہ جی واہ ---- "

الماس بائی نے میری شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر میری تعریفوں کے پل باندھ دیے۔

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا ----

میں کسی جادوئی عمل کے تابع اس کا اس درجہ غلام کیسے بن گیا تھا۔ اس کے اسی طرح استقبال کرنے ہی سے میرے سارے واہمے اور خدشات ختم ہو گئے اور میں نارمل ہو گیا۔ "الماس بائی تم حکم دو ---- میں تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں" ----

میں نے اس سے زیادہ گرم جوشی دکھائی۔

"آج خان صاحب تم سے بڑے خوش تھے۔ انہوں نے جانتے ہو کتنا انعام دیا ہے ---- "

اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دس ہزار" ----

یہ کہتے ہوئے اس نے کونے میں دھرا پرس اٹھایا اور ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔

مجھے یوں لگا جیسے میری محنت واپس آگئی۔

اس سے پہلے میں جتنا خوفزدہ، غمگین اور خود پر لعن طعن کر رہا تھا وہ سب کچھ ختم ہو گیا۔

اب میں پھر دل و جان سے اس کی خدمت کے لیے کمربستہ تھا۔

میرے والد صاحب صحیح کہا کرتے تھے کہ حرام کی کمائی سے انسان کا ضمیر ہی بدل جاتا ہے۔ میرے ساتھ بالکل یہی ہوا تھا۔ میری تو ایسی کایا پلٹی تھی جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق بن چکا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد نوری وہاں شراب کی بوتل سمیت موجود تھی ----

آج الماس بائی نے اسے خصوصی ہدایات کے ساتھ میدان میں اتارا تھا۔ نوری نے وہ وہ کمالات دکھائے کہ مجھے انسان سے جانور بنا کر رکھ دیا ---- اب وہ مجھے باؤ امین کے گھر دیکھی فلم سے بھی آگے کی کوئی چیز محسوس ہو رہی تھی ---- اس کے کام کے خاتمے پر میں نے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر اس کے گریبان میں ڈال دیے۔

نوری نے شکریہ کہہ کر بوتل اور گلاس اٹھایا اور واپس چلی گئی ----

بچپن میں میری ماں کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ ان کے گاؤں میں دو جاٹ خاندانوں میں ازل دشمنی چلی آ رہی تھی ---- میری ماں بتاتی تھی کہ جاٹ ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے لیے یوں تو بہت کچھ کیا کرتے تھے۔

لیکن ---- انتقام لینے کا ایک خطرناک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے دشمن کو طوائف کے ذریعے نشہ لگا دیا کرتے تھے۔

اسے افیم کی عادت پڑ جاتی تھی جس کے بعد وہ جیتے جی زندہ درگور ہو جاتا اور

ساری زندگی عبرت کا نمونہ بنا رہتا۔

خدا جانے الماس بائی نے میرے ساتھ کس جنم کا بدلہ اتارا تھا۔ اس کی میرے آباؤ اجداد سے کیا دشمنی تھی؟

کون سا ایسا جاٹ تھا جو میرے باپ کے خون کا پیاسا تھا۔ جس نے میرے باپ سے اپنی دشمنی کا قرض چکانے کے لیے اس طوائف کے آگے مجھے باندھ کر ڈال دیا تھا۔

پہلے پہل تو مجھے شراب پی کر تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔

لیکن ---- اب میرے حواس قائم رہنے لگے تھے۔ جو الماس بائی کے لیے برا شگون تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کا عادی بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔



دو تین گھنٹے یہاں گزارنے کے بعد جب میں نے معمول کے مطابق گھر جانا چاہا الماس بائی نے مجھے روک لیا----

"خیریت ----"

میں نے پوچھا۔

"ایک ضروری کام تھا۔ باؤ حنیف تم جانتے ہو زمانہ خراب آگیا ہے۔ کوئی شخص بھی قابل اعتبار نہیں رہا---- جوان بچیاں ہیں کس پر اعتبار کروں ---- یوں تو سارا بازار اپنا تابعدار ہے لیکن یہاں کی نیت خراب ہوتے کوئی دیر لگتی ہے ---- تمہاری بڑی مہربانی ہے ایک بڑی اہم سیاسی تقریب ہو رہی ہے جس میں پنکی نے شرکت کرنا ---- میں نوری کو بھی اس کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ تم ان کے ساتھ جانا اور انہیں اپنے ساتھ ہی لے کر واپس آنا ---- تمہاری بڑی مہربانی کتنی بھی دیر ہو جائے۔ انہیں

چھوڑ کر نہ آنا ---- زمانہ بڑا خراب ہے"-----

یہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر میرا جواب سنے بغیر دوسرے کمرے کی طرف یہ کہتے ہوئے چل دی۔

"جلدی کرو بھئی ---- تم ابھی تک تیار نہیں ہوئی۔ بیڑہ غرق جاوے گھنٹہ پہلے ہی لیٹ ہو گئی ہو۔ میاں صاحب گالیاں دے رہے ہوں گے -----"

میرا دماغ شل ہو گیا تھا----

بہت کچھ کہنا چاہتا تھا-----

لیکن ---- کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔

بس دودھ پیتا بچہ نہیں تھا کہ اس "سیاسی تقریب" کی غرض و غایت نہ جان سکتا۔ مجھے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ الماس بائی کی بیٹی پنکی اور نوری وہاں کیا کرنے جا رہی تھیں؟ میرا اس ڈرامے میں کیا رول تھا؟

اور یہ بھی کہ اس نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟

وہ کون سے منحوس لحات تھے۔ جنہوں نے مجھے نامرد بنا دیا۔ آج سوچتا ہوں تو حیران ہو جاتا ہوں ---- یوں لگتا تھا جیسے میں الہ دین کے چراغ کا جن ہوں اور اس چراغ پر الماس بائی قابض تھی -----

وہ جب چاہتی چراغ کو زمین پر گھسا کر مجھے طلب کرتی اور اپنا حکم سنا دیتی جس کی تعمیل مجھے بہر صورت کرنی پڑتی تھی -----

کچھ دیر کے لیے دماغ میں بغاوت کے کیڑے کلبلائے اور ضمیر نے بڑی لعن طعن بھی کی لیکن اچانک ہی میرے لاشعور میں چھپے گناہوں کے خوف نے اس بغاوت کو کچل کر رکھ دیا۔

"عقل کو بے وقوف ---- الماس بائی سے بگاڑ کر تو کہیں کا نہیں رہے گا"-----

میرے اندر کے خوف نے وارننگ دی۔

الماس بائی بڑی گھاگ کنجری تھی -----

اس نے میرا جواب سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ خدا جانے کتنی خطرناک واردات آج اس نے میرے ہاتھوں کروائی تھی۔ جس کے بعد اس کی دانست میں اس نے مجھے چوہے کی طرح چوہے دان میں پھنسا لیا تھا۔

میں چپ چاپ ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

الماس بائی کسی کو فون کر رہی تھی ----- شاید گاڑی منگوا رہی تھی۔ پھر وہ میرے پاس آگئی۔ بڑے بڑے لوگ آئے ہوں گے وہاں ----- بہت بڑی پرائیویٹ "گیدرنگ" ہے۔ حنیف میاں ----- اس طرح افسروں سے تعلقات بنتے ہیں۔ اپنے خول سے باہر نکلو کب تک گھر میں بیٹھے رہو گے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ترقی کرو ----- اور تم جانتے ہو کہ ایمانداری سے تنزلی تو ہو سکتی ہے ----- ترقی کے چانس ذرا کم ہی ملتے ہیں ----- بڑے بڑے افسروں سے ملاقات کا موقع ملے گا ---- باقی تم خود سمجھدار ہو ----- نوری جیسا ہیرا تمہارے پاس موجود ہے -----"

اس نے میری طرف دیکھ کر بائیں آنکھ دبائی۔

اور -----

جب مجھے اس کی بات کا مطلب سمجھ آیا تو بے غیرتی کے احساس نے مجھے مار ہی ڈالا۔ الماس بائی نے مجھے اپنی بیٹی اور نوری کا دلال بنا دیا تھا ---- اور اب اس دلال کے ثمرات مجھے گنا رہی تھی -----

اس روز میں کتنا بے بس تھا۔ کتنا نامرد ہو گیا تھا میں ----- کس قدر بے غیرتی میرے اندر چپکے چپکے سے اس نے اتار دی تھی ----- حرام اور ہوس نے مجھے کتنا نیچ بنا دیا تھا ----- اف میرے خدایا ----- آج جب ان لمحات کا تصور کرتا ہوں تو اپنے آپ

سے گھن آنے لگتی ہے۔ وہ نوری جس کو چند گھنٹے پہلے میں نے دو ہزار روپے اپنی ہوس کی قیمت ادا کی تھی ---- اب میں اپنی اس معشوقہ کو جسم فروشی کے لیے جا رہا تھا۔

اس کا دلال بن کر -----



حمیدے نے گاڑی آنے کی اطلاع دی اور دوسرے کمرے سے دونوں باہر آگئیں میں حیران رہ گیا۔ پنکی اور نوری میں ذرہ برابر فرق نہیں تھا۔ زرق برق لباس نے ان دونوں کے جنسی اعضا کو بازار کی طرح سجا دیا تھا۔ اس لباس اور میک اپ میں نوری کسی ماڈرن گھرانے کی بگڑی ہوئی صاحبزادی دکھائی دے رہی تھی -----

"چلیے حضور -----"

اس نے میری طرف دیکھ کر بالکل مغلیہ دور کی کنیزوں کی طرح کورنش بجالاتے ہوئے کہا۔

اس کی اس حرکت پر الماس بائی اور پنکی نے زوردار قہقہہ لگایا تو مجھے اپنے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ انڈیلنے کا احساس ہوا -----

صدیوں پہلے بڑی ذات کے براہمن جس طرح نیچ قوم کے اچھوتوں کے قوم میں سیسہ ڈال کر انہیں بہرہ کر دیا کرتے تھے۔ بالکل یہی سلوک میرے ساتھ الماس بائی نے کیا تھا

اس نے قدیم دور کے وحشیانہ طریقے تو اختیار نہیں کیئے تھے۔ لیکن ----- جدید دور کے منافقانہ انداز اپنا کر میری نس نس میں ہوس اور حرام کا وہ زہر انڈھیل دیا تھا کہ اب میں نہ تو اپنے کانوں سے اپنی مرضی کے مطابق کچھ سن سکتا تھا ---- اپنی آنکھوں سے مرضی کے مطابق کچھ دیکھ سکتا تھا ----

اب مجھے وہی کچھ دیکھنا' سننا' کہنا اور کرنا تھا جو وہ چاہیں ----- جس طرح ماہر پتلیوں والے بال جیسے باریک اور نظر نہ آنے والے دھاگے سے کٹھ پتلیوں کو باندھ کر نچا اور ان کا تماشا لگا کر لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔ بالکل اس طرح ایک کونے میں باندھ کر پھینک دیا تھا۔

جن قدموں پر چل کر میں الماس بائی کے کوٹھے سے باہر موجود لینڈ کروز گاڑی تک پہنچا وہ قدم میرے جسم کا حصہ ضرور تھے -----

لیکن ----- میرے نہیں تھے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ کون سی قوت تھی جو مجھے اپنے قدموں پر چلا کر یہاں تک لے آئی تھی۔ میرے عقب میں الماس بائی کا ایک فقرہ گیند کی آواز کی طرح گونج کر میرے دماغ میں دھماکے کی طرح لپیٹ رہا تھا۔

"باؤ حنیف ----- بچیوں کا خیال رکھنا" -----

خطرناک چہرے اور بڑی بڑی مونچھوں والے ڈرائیور نے ہمیں بڑے ادب و احترام سے گاڑی میں بٹھایا اور تھوڑی دیر بعد ہم نے اپنے شہر کی سب سے زیادہ مہنگے اور ماڈرن آبادی کے ایک شاندار بنگلے میں پہنچ چکے تھے -----

جس کے دروازے پر موجود مسلح پہرے داروں نے گاڑی دیکھ کر سلام کے لیے ہاتھ ماتھوں تک اٹھائے اور دروازہ کھول دیا۔

گاڑی اندر داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے ہم کسی یورپی ملک میں آ گئے ہوں۔ گیٹ سے پورچ تک کے راستے میں پھول' روشنیاں اور خوشبوؤں کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ طویل و عریض لان کے مختلف کونوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر امیر زادے شہر کی خوبصورت عورتوں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے مے نوشی سے دل بہلا رہے تھے۔

مجھے اخبارات کے مطالعے کا کچھ ایسا شوق تو نہیں تھا۔

لیکن ----- دفتر میں اخبار پڑھنے کو تو مل جاتے تھے اور چھپنے والی خبروں میں اپنے مطلب کی خبر دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس حوالے سے کچھ شناسا چہرے مجھے یہاں دکھائی دے رہے تھے۔

یہ شریف شرفا اور روسا تھے۔ ان میں بڑے بڑے سرمایہ کار' ڈپلومیٹ' افسران اور وزرا کرام بھی موجود تھے۔ نمایاں شخصیت خان صاحب کی تھی۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ اس گروپ کے لوگ ایک دوسرے کی تفنن طبع کے لیے ایسی محفلیں ہر ماہ اپنے اپنے "غریب خانوں" پر سجا لیا کرتے تھے۔

ان محفلوں میں اس ملک کے کروڑوں غریب عوام کی قسمتوں کے سودے ہوتے تھے۔ یہاں "غالب" اپنے "مغلوبوں" کو مستقل محکوم بنائے رکھنے کے منصوبے طے کیا کرتے تھے۔ شراب و شباب کی ان محفلوں پر لٹنے والا کروڑوں روپیہ ایسی محفلیں منعقد کرنے والوں کے آباؤ اجداد وان کے لیے چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ بلکہ یہ ملک کے کروڑوں غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی تھی جو انہیں بطور رشوت ان لوگوں کو ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا -----

ایم پی اے خان صاحب سے متعلق اس شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ یہاں کے گلی محلوں میں فروخت ہونے والی ہیروئن کا مالک کون ہے؟ لیکن ----- اگر اس بات کا کسی کو علم نہیں تھا تو وہ اس ملک کی ایجنسیاں تھیں۔ کیونکہ علم ہونے کی صورت میں وہ اس کے خلاف کاروائی کرتیں -----

الماس بائی کی چالاکی پر میں نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔ اس نے یہاں ایک نمبر کے ساتھ دو نمبر مال بھی چلا دیا تھا -----

اپنی بیٹی پنکی کے ساتھ نوری میراثن کو بھی اس جہنم میں دھکیل دیا تھا ----- مجھے اندازہ تھا کہ ایسی محفلوں آنے والی پیشہ ور عورتوں کی قیمت کیا ہوتی ہو گی؟ -----

یہاں معمولی فحاشائیں نہیں آتی تھیں----- مہذب فحاشائیں آتی تھیں۔

اور بے چاری نوری-----

مجھے اپنی قسمت پر تو رونا آہی رہا تھا۔

لیکن----- نوری پر بھی ہنسی آرہی تھی-----

بہر حال یہ میرے ذاتی خیالات تھے۔ حالانکہ نوری کی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔

میں جانتا تھا اس کی ایک رات کی قیمت الماس بائی کتنے ہزار روپے وصول کرے گی پھر نوری کو چند سو روپیہ دے کر ٹرخا دیا جائے گا-----



"آپ لوگ اس طرف آجائیں"-----

جیسے ہی ہماری گاڑی پورچ میں رکی اور اس سے ہم باہر نکلے ایک مہذب نوکر نے کمروں کی قطار کی طرف اشارہ کیا-----

نوری اور پنکی آگے آگے چلنے لگیں اور میں سدھائے ہوئے کتے کی طرح ان کے پیچھے چل پڑا۔ اس عظیم الشان بنگلے کی دوسری منزل پر اس سفر کا اختتام جس کمرے میں ہوا ایسا کمرہ میں نے کم از کم کسی ملکی زبان میں یا فلم میں نہیں دیکھا تھا-----

یہ ایک گول سا کمرہ تھا۔ جس کے چاروں طرف کھڑکیوں پر بیش قیمت پردے اور چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ کمرے میں سجاوٹ کے لیے رکھی گئی کسی بھی شے کی قیمت ہمارے مکان سے زیادہ ہی ہوگی۔

گولائی میں نہایت آرام دہ صوفے رکھے ہوئے تھے جن کے سامنے اخروٹ کی لکڑی سے بنے بیش قیمت میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے درمیان میں رکھی ایک لمبی میز پر دنیا کی بیش قیمت شراب کی بوتلیں اور جام رکھے ہوئے تھے اور یہی جام

یہاں موجود بیشتر لڑکیوں اور میرے جیسے ان کے "دلالوں" کے ہاتھوں میں دکھائی دے رہے تھے-----

قریباً ہر صوفے پر دو تین لڑکیاں اور ان کے باڈی گارڈ موجود تھے-----

مصر کا بازار سجا ہوا تھا-----

اس گول کمرے سے ملحقہ کمروں کے مختلف دروازے کھلتے اور بند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے ہر دروازے کی آہٹ پر یہاں بیٹھی لڑکیوں کی گردنیں دروازوں کی طرف گھوم جاتیں-----

دروازے کے عقب سے کوئی "شریف زادہ" برآمد ہوتا اور یہاں موجود کسی بھی لڑکی کا بازو پکڑ کر اس دروازے کے عقب میں غائب ہو جاتا۔ اب تک جو لوگ یہاں آئے تھے ان میں کسی کی عمر پچاس سال سے کم نہیں تھی-----

ان میں سے کسی کی حیثیت "وی آئی پی" سے کم نہیں تھی۔

میں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا-----

الماس بائی کی بیٹی نے اپنے اور نوری کے لیے چھوٹے چھوٹے جام تیار کر لیے تھے۔ میرے لیے یہ بھی انکشاف تھا کہ نوری کو ان کمبختوں نے میری طرح اس غلیظ عادت میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔

حیرت تو اس بات پر ہو رہی تھی کہ نوری کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بامر مجبوری یہ سب کچھ کر رہی ہے یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ اس کا آئیڈیل ہو۔

اس روز تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی میرے دماغ سے نوری کے عشق کا بھوت تو

لیکن----- ایک خوف نے مجھے بری طرح جکڑا ہوا تھا اور وہ تھا پولیس کا خوف-----

جیدے نے کچا پرچہ کروایا ہوا تھا-----

دوسری طرف میں نے اپنے افسر اعلیٰ کے کمرے سے سرکاری فائل چوری کی تھی۔

یہ دونوں ناقابل معافی جرم تھے۔ اس محکمے کا ملازم ہونے کے ناطے کم از کم اس بات سے میں بخوبی آگاہ تھا کہ اگر فائل چوری کا جرم ثابت ہو جاتا تو مجھے پانچ سال کے لیے جیل جانا پڑتا۔

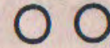
اس روز میں نے اپنے آپ کو انسانیت کی سطح سے ہی گرا دیا تھا-----

میری آنکھوں کے سامنے ان دونوں کو بھی باقی لڑکیوں کی طرح دو موٹے موٹے پیٹوں والے صنعت کار اپنے بغلوں میں دبا کر لے گئے-----

اب میں وہاں اکیلا موجود تھا-----

میرے جیسے تین چار اور بھی ایک دوسرے سے نظریں چرائے وہاں بیٹھے تھے وہ سب مفت کی شراب پر ندیدے بچوں کی طرح ٹوٹ پڑے تھے-----

جب کہ آج شدت سے شراب سے نفرت ہو رہی تھی----- میں نے اس روز اپنے آپ سے ایک قسم کھائی کہ اب ساری زندگی کم از کم شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا -----اور کوشش کر کے اس ہوس کی غلامی سے خود کو آزاد بھی کروا لوں گا-----"



آدھی رات کے بعد جب دونوں فاحشائیں اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے بعد میرے ساتھ واپس جا رہی تھیں تو ان کا سارا رنگ روپ دیوار پر لگے کچے رنگوں کی طرح اتر چکا تھا-----

دونوں لٹکی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں-----

جس طرح چپ چاپ میں آیا تھا اسی طرح چپ چاپ واپس لوٹ آیا۔ جب سر بازار میں پہنچے تو بازار کی رونقیں اجڑ چکی تھیں----- وہاں پولیس کا راج تھا-----

لیکن ----- ڈرائیور کو جب بھی کسی پولیس والے نے روکا اور اس نے خان صاحب کا نام لیا تو اسے فوراً جانے کی اجازت دے دی گئی۔

الماس بائی نے ان دونوں کا استقبال اس طرح کیا جیسے وہ دہلی کا لال قلعہ فتح کر کے واپس آئی ہوں-----

اس نے میرا بھی شکریہ ادا کیا اور میں نے بے شرموں کی طرح دانت نکال دیے مگر جانے کا وقت نہیں دیا تھا-----

میں وہیں ایک کمرے میں قالین پر بے سدھ ہو کر سو گیا۔ صبح اٹھ کر وہیں سے تیار ہوا اور اپنے دفتر پہنچ گیا۔

دفتر کے باہر ہی میری نظر اپنے والد صاحب پر پڑی تو دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

والد صاحب نے مجھے رکشہ سے اترتے دیکھ لیا تھا اور سیدھے میری طرف آ رہے تھے۔

آج حیرت انگیز طور پر اور خلاف معمول انہوں نے مجھ سے بڑی نرمی سے بات کی۔

"رات گھر نہیں آئے بیٹا"-----

"کیا لینے آؤں ----- وہاں مجھے کوئی منہ لگانے کو بھی تیار نہیں۔ آپ نے اس حرام خور جیدے اور کونسلر کی بات پر یقین کر لیا اور مجھے پوچھا تک نہیں"-----

میں نے الٹا ان پر چڑھائی شروع کر دی۔

"دیکھو بیٹا----- تم میری واحد نرینہ اولاد ہو----- میں کم از کم اتنا کمزور آدمی نہیں کہ اپنے اصولوں پر تمہارے ہاتھوں بلیک میل ہو سکوں----- لیکن بدقسمتی سے یہی ایک بوڑھی عورت کا شوہر اور جوان بیٹی کا باپ ہوں جو تمہاری ماں اور بہن بھی لگتی ہیں----- تم میری سفید داڑھی کا نہیں تو ان کی ہی شرم کر لو----- انہیں نہ ستاؤ-----

خدا کے غضب سے ڈرو ----- ایسا نہ ہو کہ تم گناہوں کی دلدل میں اتنے گہرے اتر جاؤ کہ پھر میری اور تمہاری "ماں کی دعائیں بھی بے اثر ہو جائیں"-----

اتنا کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر ایک کونے میں رکھی اپنی سائیکل سنبھالی اور اسے ہاتھ میں پکڑ کر پیدل ہی چلتے چلے گئے -----

اس روز پہلی مرتبہ میرے ضمیر نے مجھ پر بے پناہ ملامت کی ----- "

شاید ابھی میرے والدین کی دعاؤں کی قبولیت کے لمحات ختم نہیں ہوئے تھے۔

میں نے وہاں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ اب زندگی بھر الماس بائی کے کوٹھے پر نہیں جاؤں گا۔

اگر نوری کی محبت نے مجھے دلالی پر ہی مجبور کرنا تھا تو ایسی محبت اور ایسی نوری پر ہزار بار لعنت -----

اگر میرا مقصد جنسی لذت کا حصول ہی ہے تو اس شہر میں اس کی کوئی کمی نہیں ----- یہی سوچتا میں دفتر پہنچا تھا-----



اس روز میں نے خلاف معمول کسی سے زیادہ بات ہی نہیں کی۔

لیکن ----- اپنے رویے کو نارمل بھی رکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ اپنے عمل سے کسی کو مشکوک ہونے کا موقعہ دوں -----

دو دن تک میں نے یہی طرز عمل اختیار کیا۔ اس درمیان میں الماس بائی اور رنگی خان کے گھر بھی نہیں گیا لیکن ----- نوری کو نہیں بھلا سکا۔

خدا جانے میرے اندر کون سا شیطان آ براجمان ہوا تھا جو ابھی تک مجھے اس کی بے گناہی کا یقین دلا رہا تھا-----

میں نے اس روز مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ نوری کو اس گناہ آلود زندگی سے نکل جانے کے لیے رضامند کر لوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں صدق دل سے توبہ کر لوں میرے والدین کے لیے نوری کو بہو کی حیثیت سے قبول کرنے میں بھی کوئی عار نہیں تھا۔

نجانے کیوں میرا دل بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا کہ نوری کو سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے اس کام کے لیے اگلے روز استاد رنگی خاں کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

الماس بائی کی بلیک میلنگ سے بچنے کے لیے میں نے کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں تبادلہ کروانے کا پروگرام بنایا تھا ہمارے ہی محکمے میں ایسے شعبے بھی موجود تھے جن میں الماس بائی جیسی فاحشاؤں اور خان صاحب جیسے "شرفاء" کے لیے کافی دلچسپی کا سامان لیں تھا۔

میں نے گزشتہ چند روز سے بازار میں جانا ہی چھوڑ دیا اور والدین نے میری اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا اور بے چارے دل ہی دل میں شاید اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا کر رہے تھے کہ ان کی دعائیں بہرحال رنگ لے آئی ہیں اور ان کا بیٹا راہ راست پر آ گیا ہے-----

لیکن ----- میرے والد نے مجھے جو بشارت دی تھی اصل میں وہ سچی تھی ----- انہوں نے صحیح کہا جو کہ میں گناہوں کی دلدل میں بہت دور اور گہرا اتر گیا ہوں ----- اور اب مجھ پر توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

میرے گناہ اتنے بڑھ گئے تھے کہ رحمت الٰہی نے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا-----

اب مکافات عمل ہو رہا تھا۔

اور -----

مجھے خود کو اس کے لیے تیار کرنا تھا۔

حکم صادر ہو چکا تھا۔

مجھے اس کی پابندی کرنی تھی-----

اپنے اس عزم کا اعادہ کرتا میں اس روز جب دفتر پہنچا تو کچھ تاخیر ہو چکی تھی۔ دفتر میں اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے حسب معمول سب کو اونچی آواز سے سلام کیا تو خلاف معمول اپنے ساتھیوں کو قدرے سنجیدہ پایا۔

"خیریت-----"

میں نے اپنے ایک بزرگ ساتھی کی طرف دیکھ کر پوچھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"یار حنیف اللہ ہی رحم کرے معاملہ بڑا گڑبڑ ہے"-----

اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کچھ بتاؤ گے بھی یا پہیلیاں ہی بجھواتے رہو گے۔"

میں نے بے چینی سے پوچھا۔

چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق مجھے ابھی سے پریشان لگ گئی تھی۔

"جعفری صاحب کے کمرے سے ایک اہم فائل غائب ہے اور ایف آئی اے والے انکوائری کر رہے ہیں"-----

دوسرے ساتھی نے کہا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا-----

لیکن ---- دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی دانست میں سنبھل کر کہا۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ---- اس دفتر میں ڈیڑھ دو سو لوگ کام کرتے ہوں گے ---- ہمارا اس سے کیا تعلق؟" ----

میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر میز کا سہارا لیا۔

"یار ---- یہی تو پریشانی کی بات ہے ---- ابھی ان کا ایک افسر آیا تھا۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ فائل اسی ڈیپارٹمنٹ میں کسی کے ہاتھ لگی ہے ---- وہ تو وارننگ دے گیا ہے کہ اگر آج شام تک فائل واپس نہ پہنچی تو وہ لوگ کل ہم سب کو تھانے لے جائیں گے اور سب سے الگ الگ تفتیش ہو گی" ----

میرے ساتھی نے جواب دیا۔

"جی یہ کیا بات ہوئی ---- یار یہ تو بے انصافی ہے ---- کرے کوئی اور بھرے کوئی

میں نے دوبارہ حوصلہ کیا۔

"بے انصافی نہیں ---- ظلم ہے ظلم ---- میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یونین والوں کے فارم پر کر دو ---- ارے کوئی ہمارے ساتھ تو کھڑا ہوتا اب رہ گئے ناں اکیلے ----"

بشیر میاں نے کہا جو سرکاری زمین کی یونین کے عہدے دار اور ہمارے ساتھی تھے ----

"میاں جی فارم جو بھر دیں گے ---- لیکن اس مصیبت سے جان چھڑاؤ ---- یار ہم غریب لوگ مارے جائیں گے" ----

میں نے بظاہر نارمل ہوتے ہوئے کہا۔

"میرے تو سوچ سوچ کر جان نکل رہی ہے ---- یہ پولیس والے تو کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ ارے ان کے نزدیک گدھا گھوڑا ایک برابر ہے ----"

بھٹی صاحب نے جن کی ریٹائرمنٹ کو مشکل تین چار ماہ باقی تھے کہا۔

"بھٹی صاحب گھبرائیں نہیں اللہ خیر کرے گا۔ جیسا ہم نے کچھ کیا بھی نہیں تو خوف کس بات کا" ----

میں نے پھر حوصلہ کیا۔

ابھی ہم اپنے خدشات کا اظہار ہی کر رہے تھے کہ اچانک دروازے سے ایک تھانیدار اور سپاہی اور سفید کپڑوں میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا آدمی اندر داخل ہوا۔

"یہی آیا تھا صبح" ----

بشیر میاں جو میرے قریب کھڑے تھے میرے کان میں سرگوشی کی۔

تھانیدار نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی اور ہم سب کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے قصائی ذبح ہونے والے بکروں کو دیکھتا ہے ----

"دیکھو بھائیو ---- میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں۔ تم بھی میری طرح سرکاری ملازم ہو میں کسی کا برا نہیں چاہتا ---- شرافت اس میں ہے کہ جس کسی نے فائل چرائی ہے واپس کر دے۔ میں صرف اس کی رعایت دے سکتا ہوں کہ اس پر ہم کیس نہیں بنائیں گے اور صرف چند دنوں کے لیے معطل کر دیں گے کیونکہ سرکاری کاروائی بھی ضروری ہے ---- لیکن اگر تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مجھے بے وقوف بنا لو گے تو اس بات کو بھول جاؤ ---- فائل تو تمہیں واپس لوٹانی ہی پڑے گی ---- اب اس بات کا فیصلہ آپس میں کر لو کہ جوتے کھا کر واپس لوٹاؤ گے یا شرافت سے ---- ایک بات میں تمہیں بتا دوں ---- تم نے ہماری ایجنسی کا صرف نام ہی سنا ہے ---- ایک مرتبہ اگر ہمارے تفتیش مرکز میں جانا پڑ گیا تو یاد رکھنا وہاں سے مکمل جسم کے ساتھ کوئی قسمت والا ہی واپس لوٹتا ہے ---- میری بات سمجھ گئے ناں ---- اپنا اور ہمارا وقت ضائع نہ کرو"

لمبے تڑنگے آدمی نے کہا۔

"اوئے دیکھو اوئے ---- تم غریب آدمی ہو۔ خواہ مخواہ مارے جاؤ گے ---- ملک صاحب نے جیسے فرمایا ہے اس پر عمل کرو ---- ورنہ یاد رکھنا میں وہ لتر پھیروں گا کہ زندگی بھر کبھی سیدھے ہو کر اپنے قدموں پر نہیں چل سکو گے"-----

اب تھانیدار کی ڈرانے دھمکانے کی باری تھی -----

"اوئے سیدھے کھڑے رہو ---- مجھے کسی نے افسروں کے سامنے کھڑے ہونے کی تمیز نہیں سکھائی"-----

اچانک ہی ایک حوالدار بشیر میاں پر دھاڑا جن کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور ان سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"دیکھئے جناب میں معزز آدمی ہوں ---- میرے ساتھ اس لہجے میں بات نہ کریں "-----

بشیر میاں نے یونہی لیڈری دکھانی چاہی۔

"اوئے تیرے معزز کی۔"

جواب میں تھانیدار نے ان کو غلیظ گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

سب سہم کر رہ گئے۔

میری تو یہ حالت تھی کہ بدن میں لہو نہیں۔

دو تین منٹ میں مزید ڈرانے دھمکانے کے بعد وہ لوگ جس طرح آندھیوں اور طوفان کی طرح آتے تھے اس طرح واپس لوٹ گئے۔

روانگی سے پہلے انہوں نے ہمیں نادر شاہی حکم سنایا تاکہ چھٹی کے بعد کسی کو گھر جانے کی اجازت نہیں اور وہ اب آئیں گے۔ اگر اس وقت تک فائل نہ ملی تو پھر ہم سب کا باری باری ریمانڈ لے کر تفتیش کی جائے گی۔

ان کی روانگی کے بعد کافی دیر تک ہم سب کو سانپ سونگھے رہا ---- کسی کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

بالآخر بھٹی صاحب نے حوصلہ کیا۔

"دیکھو یار اگر ہم میں سے کسی نے فائل غلطی سے کہیں رکھ دی ہے تو خدا کے لیے واپس لے آؤ۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ میں تو مر جاؤں گا ---- یار میری جوان بیٹیاں ہیں ---- تم سب جانتے ہو اگلے مہینے میری بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے ---- یار خدا کے لیے میری حالت پر رحم کرو ---- میں تو پہلے ہی دل کا مریض ہوں۔"

انہوں نے اپنی جیب میں رکھی شیشی سے دو گولیاں نکال کر زبان کے نیچے رکھ لی تھیں۔

"بھٹی صاحب ---- آپ پریشان نہ ہوں اللہ خیر کرے گا۔ جب ہم نے فائل اٹھائی ہی نہیں تو ہمارے ساتھ زیادتی کا کیا مطلب ---- میں ابھی صدر صاحب سے بات کرتا ہوں ---- سالے کی پیٹی اتروا دی تو کہنا ---- ارے! میں تو ہڑتال کروا دوں گا ---- مجھے گالیاں دینے لگا میں اس سالے کی گالیوں کا مول نہ چکاؤں تو میرے منہ پر تھوک دینا"-----

بشیر میاں جوش غضب سے دھاڑے۔

انہیں گالیوں کا غصہ ان لوگوں کے جانے کے بعد آیا تھا۔

یار بات تو ٹھیک ہے ---- جس افسر کے کمرے سے فائل گم ہوئی ہے اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں اور ہم غریب ملازمین کو خواہ مخواہ پریشان کر رہے ہیں -----

ایک اور صاحب نے کہا ----

وہ لوگ کیوں خوفزدہ تھے؟

مجھے فی الوقت اس سوال کا جواب نہیں چاہیئے تھا۔ مجھے تو اپنی جان بچانا تھی۔

جس طرح خفیہ ایجنسی کے لوگ اس معاملے میں آگئے تھے اس سے یہی لگتا تھا کہ فائل کوئی بہت اہم دستاویز پر مشتمل تھی۔ یوں بھی الماس بائی مجھ سے معمولی کام تو کروا نہیں سکتی تھی۔

مجھے اور لوگوں کا تو علم نہیں تھا۔

لیکن ----- یہ جانتا تھا کہ اگر پولیس کے قابو آگیا اور انہوں نے مجھ پر تشدد کیا تو میں ضرور اقبال جرم کرلوں گا۔

لیکن ----- اس کے بعد کیا ہوگا؟

اس سوال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

میرے تو مقدمے کی بھی کوئی ڈھنگ سے پیروی نہیں کرسکے گا۔ اس دفتر میں تو آئے روز کوئی نہ کوئی گھپلا ہو رہا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ ایک مرتبہ ایک جرم کا اقبال کرنے کے بعد پھر باقی سب کچھ بھی میرے سر منڈھ دیا جاتا۔

میری تو ساری زندگی پھر جیلوں میں ہی کٹ جاتی -----

اور ----- میں جیل میں چلا گیا تو نوری کا کیا بنے گا؟

میں نے جس کے لیے خود کو انسانیت کی سطح سے گرا دیا ----- اپنی نظروں میں ذلیل ہوگیا۔ اس نوری کا کیا بنے گا؟

مجھے تو وہ کبھی نہیں مل پائے گی؟

ان خیالات نے مجھے پھر باؤلا کر دیا۔

O O

دوپہر کو معمول کے مطابق جب ہم لنچ کرنے کے لیے دفتر کی کینٹین میں جا رہے تھے تو میں ساتھ والے پی سی او سے الماس بائی کو کپکپاتی انگلیوں سے فون کر رہا تھا۔

"کیا حال ہے حنیف باؤ ----- کیا ناراض ہو گئے ہو۔ دو دن سے تمہاری شکل نظر

نہیں آرہی" -----

الماس بائی نے چھٹتے ہی دریافت کیا۔

"مجھے بخار ہو گیا تھا -----"

میں نے بے غیرتی سے جھوٹ بول دیا۔

"اوہو ----- مجھے بتاتے تمہاری ڈاکٹرنی کو علاج کے لیے بھیج دیتی ----- میں خود آجاتی" -----

اس نے بے شرمی کی گفتگو شروع کر دی۔

"الماس بائی یہاں معاملہ بہت سنجیدہ ہو گیا ہے؟ -----

میں نے اپنی گھبراہٹ سے بے قابو ہو کر کہا۔

"کیا ہوا ----- کیا قیامت آگئی -----"

اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں دریافت کیا۔

"فائل کی چوری کی خبر ہو گئی ہے ----- یہاں پولیس والے آئے ہوئے ہیں اور شام تک ہم سب کو تفتیش کے لیے گرفتار کرلیں گے" -----

میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہو ----- اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ----- تم نہ ماننا' باؤ حنیف کوئی خدا واسطے تو تم نے کام نہیں کیا" ----- اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میرا تو خون ہی کھول اٹھا -----

جی چاہا ابھی جاؤں اور اس فاحشہ کا ٹینٹوا دبا دوں -----

لیکن ----- مصلحت کا تقاضا کچھ اور تھا -----

بالآخر میرے ذہن نے راہ سجھا ہی دی۔

"دیکھو الماس بائی ----- میں نے ساری زندگی تھانہ کچہری نہیں دیکھے۔ میں پولیس

کی مار نہیں کھا سکتا۔ اگر انہوں نے میرے ساتھ مار پیٹ شروع کی تو میں صاف صاف بتا دوں گا ---- اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے پیسے لیے ہیں ---- لیکن یہ تم بھی جانتی ہو کہ کتنے پیسے تم نے لیے ہیں؟"

میرا لہجہ اور گفتگو یقیناً الماس بائی کے لیے چونکا دینے والا تھا ----

میں یہاں سے اس کی شکل تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

لیکن ---- مجھے یقین تھا کہ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ رہی ہوں گی کہ یہ واقعی یہ میری ہی آواز ہے یا مجھ میں کوئی جن آ گیا ہے ----

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی ----

شاید حرافہ اگلی پلاننگ کر رہی تھی۔

"اوہو ---- میرا مطلب یہ نہیں تھا ---- حنیف باؤ میرا مطلب تھا کہ اگر تم خان صاحب کا نام لو گے تو وہ بڑا خطرناک آدمی ہے ---- پولیس کو بھی قابو کر لے گا اور تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا" ----

اس نے بظاہر بڑے نرم الفاظ میں مجھے دھمکی دی۔

"الماس بائی میرا دماغ تو خراب نہیں ہوا کہ خان صاحب کا نام لوں گا ---- میں تو تمہارا نام لوں گا اور یہی نہیں پچھلے بھی سارے کارنامے جو تم نے مجھ سے انجام دلائے ہیں سب بتا دوں گا ---- الماس بائی میں تو ڈوبا ہی ہوں لیکن بچو گی تم بھی نہیں ---- یہ کوئی چوری ڈاکے کا مقدمہ نہیں جو مجھ پر ہی ختم ہو جائے گا ---- بہرحال پولیس کو بتانا پڑے گا فائل کہاں گئی ----"

میرے اندر بھی جن داخل ہو گیا تھا۔

"ہائے اللہ ---- کمال کرتے ہو تم بھی حنیف باؤ ---- میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا ---- تم بے فکر رہو۔ الماس بائی کے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا

---- میں ابھی اپروچ لڑاتی ہوں ---- بس تم زبان نہ کھولنا ---- اگر پولیس لے جائے تو بے فکر رہنا ----"

اس نے اچانک ہی پینترہ بدل لیا۔

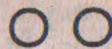
لیکن ---- میں ابھی اپنے قدموں پر جما تھا ----

"نہیں الماس بائی ---- کہیں کیوں لے جائیں اگر کہیں لے جانا ہے تو ہم اکٹھے جائیں گے۔ اکیلا کیوں جاؤں گا میں ----"

میں اب اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"اچھا باؤ اچھا ---- بے فکر رہو۔ میں کچھ کرتی ہوں" ----

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا ----



میرے ہونٹوں پر خواہ مخواہ مسکراہٹ جم گئی ----

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی فتح کا احساس ہوا تھا ---- میں نے اپنے دفتر کی طرف واپس آتے ہوئے سوچا کاش مجھ میں کچھ روز پہلے یہ مردانگی آ گئی ہوتی۔

اپنے دفتر میں واپس پہنچا تو میں قدرے مطمئن ہو گیا تھا ----

لیکن ---- ایک بے نام سا خوف میرے اندر در آیا تھا۔

بالکل ایسا خوف جو سانپ کی پٹاری میں ہاتھ دیتے ہوئے در آتا ہے۔ جو شیر کی چھار کے سامنے سے گزرتے ہوئے انسانی حواس پر طاری ہو جاتا ہے۔

ان لمحات نے جب الماس بائی سے جہنم کی آگ میں اتر جانے کا مشورہ دے رہی تھیں مجھے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر کے بہادر ضرور بنا دیا تھا۔

لیکن ---- یہ بات میں بھی جانتا تھا کہ الماس بائی اپنی اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گی۔ اگر میں اسے منت سماجت سے مناتا تو اور بات تھی لیکن ---- میں نے اس

پر اس کا داؤ آزمایا تھا---- اور یہ امراس کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔

میں جانتا تھا اس وقت الماس بائی کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ لیکن ---- جو
نے کہا اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہو سکتا تھا۔

سہ پہر کو ہماری چھٹی ہونے سے چند منٹ پہلے پولیس والے پھر آن دھمکے
انہوں نے پہلے تو معمول کے مطابق ہم سب کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا پھر ہمیں
ملا کہ اس کمرے سے باہر نہ جائیں ----

وہ لمبا تڑنگا آدمی جس کا نام ملک تھا۔ ملحقہ کمرے میں بیٹھ گیا اور اب نیا کھیل
شروع ہو گیا۔

ایک ایک کر کے وہ سب کو بلانے لگا سب سے پہلے بھٹی صاحب کی باری آئی
خدا جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا قریباً دس منٹ کے بعد مجھے بلایا گیا----
ڈرتے ڈرتے کمرے میں گیا

"کیا نام ہے تمہارا اوئے"----

میرے اندر گھستے ہی ملک غصے سے دھاڑا

"جی محمد حنیف----"

میں نے سہم کر جواب دیا۔

"اوہ تو تم محمد حنیف ہو----"

ایک گہری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر جمی جب اس نے یہ فقرہ ادا کیا
سگریٹ سلگا کر لمبا کش لیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

بڑی زبردست سفارش ہے بھئی تمہاری ---- خیر اس کمرے کے دو
دروازے سے نکل جاؤ۔ خبردار کسی کو پتہ نہ لگے اور اپنے ساتھیوں کو یہ شک نہ
دینا کہ میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا تھا---- دیکھو یار ہماری بھی تو ڈیوٹی کا سوال

"----

وہ مجھ سے ایسے بات کر رہا تھا جیسے ہم بڑے تیرے رازداں ہوں اور یہاں ایک
رے کا دکھ درد بٹانے بیٹھے تھے۔

"حنیف صاحب بڑی اہم فائل چوری ہو گئی ہے ---- آپ عزت دار آدمی ہیں
ہمارے دوست بھی ہیں۔ لیکن میری ایک درخواست ہے کہ اگر آپ اس کی تلاش
مدد کر سکیں۔ کم از کم ایسے ایک دو آدمیوں کی نشاندہی کر دیں جن پر شک ہو سکتا
----"

اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"دیکھئے جناب میں غریب آدمی ہوں---- میں تو یہاں سے جا کر ایک اور نوکری کر
اپنا گھر چلاتا ہوں ---- آپ سب سے پوچھ لیں میں صرف اپنے کام سے کام رکھتا
اسی لیے یہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے ---- میری یہاں کسی سے بے تکلفی ہے
نہیں ---- بخدا میں کچھ نہیں بتا سکتا"----

میں نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے---- ٹھیک ہے ---- آپ جائیں"----

اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

میں اس کے حکم کے مطابق دوسرے دروازے سے اس طرح باہر نکلا جس طرح
بھاگا کرتے ہیں۔ کسی نے مجھے جاتے نہیں دیکھا تھا اور میں چشم تصور سے اپنے
گناہ ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا۔

ان بے چاروں کی خوف سے گھگی بندھی تھی۔

خدا جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا۔

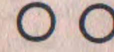
پولیس والوں کے دماغ میں ایک مرتبہ جو بات سما جائے اس کا نکلنا مشکل ہی ہوتا

ہے جب انہوں نے یہ تصور کر لیا تھا کہ جعفری صاحب کی فائل اس کمرے میں گم
ہوئی ہے تو یقیناً یہاں ہی سے برآمد کرنی تھی-----

میرا ضمیر ملامت ضرور کر رہا تھا کہ میں نے خود اس پھندے سے نکل کر
گناہوں کو ان قصائیوں کے سامنے ڈال دیا ہے۔

لیکن ----- اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

بصورت دیگر مجھے اقرار جرم کر کے باقی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بسر کرنا
پڑتی۔



میں موٹر سائیکل سٹینڈ کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک ہی پراچہ میرے سامنے آ گیا
بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے ہی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

"کچھ کہا تو نہیں انہوں نے؟؟"

اس نے چھوٹتے ہی دریافت کیا۔

"نہیں یار ----- تمہارے جیسے دوستوں کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال ہے جو
ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے"-----

میں نے پراچہ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ ----- تھینک گاڈ ----- یار شکر ہے خدا کا ----- بھئی یہ ملک بڑا ٹیڑھا ہو گیا
ہے۔ مجھے جیسے ہی خان صاحب کا فون ملا فوراً ان کے افسر اعلیٰ کی طرف دوڑا
لیکن وہاں پتہ لگا کہ وہ تو تھوڑی دیر پہلے دوسرے شہر جا چکے ہیں ----- لو جی اب ہو
ہوں خدا خدا کر کے ایک گھنٹے بعد فون پر بات ہوئی ----- اب نئی مصیبت کہ ملک
رابطہ نہیں ہو رہا ----- بہر حال اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی ----- یار اب ذرا محتاط ہی رہا کرو
----- جس معاملے میں سیکورٹی ایجنسیاں آ جائیں وہ جلدی ٹھیک نہیں ہوا کرتا-----"

اس نے مجھے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"یار تمہارا بہت شکریہ پراچہ۔ میں جانتا تھا کہ الماس بائی تم سے ہی یہ کام کیے
گی-----"

میں نے اسے کریدنے کے ہی انداز میں اگلی بات کے لیے تمہید باندھی۔

"ارے ----- میں اس گشتی کو کیا سمجھتا ہوں ----- مائی فٹ -----"

اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"سالی دو ٹکے کی طوائف ----- سپلائر ----- اس کے علاوہ اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔
یار ہم بھی کوئی اچھے آدمی نہیں ہیں ----- لیکن یہ تو بڑی بدمعاش عورت ہے -----
اسے کمیشن کھانے کو ہی اپنا دھندہ بنا لیا ہے ----- خدا جانے خان صاحب پر کیا تعویذ
کروا دیے ہیں کہ اتنا بڑا اور اتنے اثر و رسوخ والا آدمی بھی اس کی ہر ہاں میں ہاں ملا
دیتا ہے ----- ایک مرتبہ خان صاحب کو اس کی اصلیت کا علم ہو جائے ----- پھر دیکھنا
اس سالی کی تو اس کی اوقات نہ دکھا دوں تو میرا نام بھی پراچہ نہیں کچھ اور رکھ دینا
-----"

اس نے بڑی تلخی سے کہا۔

"پراچہ یار میرے ساتھ بھی بڑی زیادتی ہوئی ہے ----- کاش میں نے اس روز
تمہاری بات مان لی ہوتی ----- اس حرام خور نے لاکھوں روپے میرے ذریعے کمائے
ہیں اور مجھے چند ہزار پر ٹرخا دیا -----"

میں نے آغاز کیا-----

"یار حنیف باؤ تم کیوں اس کے چنگل میں پھنسے ہو ----- لعنت بھیجو ----- میں
تمہیں کام لا کر دیا کروں گا۔ ففٹی ففٹی پر ----- تمہیں کس بات کی کمی ہے یار -----"

اس نے میرے ساتھ ساتھ کینٹین کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

"پراچہ یار میری ایک بڑی کمزوری اس کے ہاتھ لگ گئی ہے-----"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"کون سی؟"

پراچہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نوری-----"

میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"لعنت بھیجو یار----- ٹھیک ہے اس کو قدرت نے بڑا سیکسی بڑا خوبصورت جسم دیا ہے لیکن یار یہ دنیا اسی پر تو ختم نہیں ہو جاتی"-----

پراچہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"پراچہ یار کاش میں تمہیں بتا سکتا۔ بات اس کے جسم کی نہیں۔ میرے دل کی ہے یار میں کیا کروں میرا دل میرے بس میں نہیں رہا-----"

میں نے اس کے ساتھ ہی اسے ساری کہانی الف سے ی تک سنا دی۔

پراچہ بڑی ہمدردی اور دلجمعی سے میری باتیں سنتا رہا۔ میری گفتگو کے خاتمے پر ہم دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر پراچہ نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"اچھا تو یہ بات ہے----- میں بھی کہوں کہ یہ سالی پچھلے چار پانچ مہینوں میں اچانک نوری پر اتنی عاشق کیوں ہو گئی ہے----- حالانکہ وہ اس کے گھر گزشتہ تین چار سال سے کام کر رہی تھی----- اب تو اسے اپنی بیٹی کے ساتھ محفلوں میں بھیجنے لگی ہے-----"

"مجھے اس بات کا علم ہے پراچہ----- لیکن میں نے کہا ناں کہ میں دل کے ہاتھوں بالکل بے بس ہو چکا ہوں----- مجھے وہ اس حالت میں بھی قبول ہے۔ یار میں ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھول سکوں گی----- کسی نہ کسی طرح نوری کو اس کے

سے نکالو-----"

میں نے اسے بڑی عاجزی سے کہا۔

پراچہ اب واقعی سنجیدہ ہو گیا تھا----- شاید اسے میری حالت پر رحم آ رہا تھا اور دل ہی دل میں شاید وہ میرے پاگل پن پر ہنس بھی رہا تھا۔

"دیکھو یار حنیف باؤ----- میری بات سن کر تمہیں دکھ تو بہت ہو گا لیکن ہے سچی بات----- میں تو ہر طرح حاضر ہوں----- میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دے سکتا ہوں کہ اگر نوری اس گناہ کی دنیا سے نکلنا چاہے تو الماس بائی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گی۔ میں خان صاحب کی بھی منت سماجت کر کے انہیں مناؤں گا----- لیکن مجھے لگتا نہیں کہ ایسا ہو----- میں بھی زندگی میں اس کیفیت کا شکار رہا ہوں جس سے تم گزر رہے ہو----- ان معاملات پر انسان دماغ کی بجائے دل سے سوچتا ہے----- اور دل کی سوچ عموماً اسے گمراہ کر دیتی ہے----- میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں بھی کہوں گا کہ تم نے نوری کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے----- ایسی عورتوں کی نفسیات بڑی عجیب ہوتی ہیں وہ ایک مرد پر گزارہ نہیں کر سکتیں----- الماس بائی نے اسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پلا دیا ہے----- برا نہ ماننا تمہارے پاس ایسا کوئی "سوشل اسٹیٹس" نہیں جو اس کے لیے باعث ترغیب ہو-----

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

شاید اسے میرے رد عمل کا انتظار تھا-----

"پراچہ تمہاری بات ٹھیک ہو گی لیکن ایک مرتبہ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟" یار میں تمہیں کیسے سمجھاؤں"-----

میں نے بے بسی سے کہا۔

خدا جانے اس لمحے میرے لہجے میں کون سا دکھ سمٹ آیا تھا کہ پراچہ بھی متاثر

"پراچہ یار میری ایک بڑی کمزوری اس کے ہاتھ لگ گئی ہے-----"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"کون سی؟"

پراچہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نوری-----"

میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"لعنت بھیجو یار---- ٹھیک ہے اس کو قدرت نے بڑا سیکسی بڑا خوبصورت جسم دیا ہے لیکن یار یہ دنیا اسی پر تو ختم نہیں ہو جاتی"-----

پراچہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"پراچہ یار کاش میں تمہیں بتا سکتا۔ بات اس کے جسم کی نہیں۔ میرے دل کی ہے یار میں کیا کروں میرا دل میرے بس میں نہیں رہا-----"

میں نے اس کے ساتھ ہی اسے ساری کہانی الف سے ی تک سنا دی۔

پراچہ بڑی ہمدردی اور دلجمعی سے میری باتیں سنتا رہا۔ میری گفتگو کے خاتمے پر ہم دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر پراچہ نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"اچھا تو یہ بات ہے ---- میں بھی کہوں کہ یہ سالی پچھلے چار پانچ مہینوں میں اچانک نوری پر اتنی عاشق کیوں ہو گئی ہے ---- حالانکہ وہ اس کے گھر گزشتہ تین چار سال سے کام کر رہی تھی ---- اب تو اسے اپنی بیٹی کے ساتھ محفلوں میں بھیجنے لگی ہے -----"

"مجھے اس بات کا علم ہے پراچہ ---- لیکن میں نے کہا ناں کہ میں دل کے ہاتھوں بالکل بے بس ہو چکا ہوں --- مجھے وہ اس حالت میں بھی قبول ہے۔ یار میں ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھول سکوں گی ---- کسی نہ کسی طرح نوری کو اس کے چنگل

سے نکالو-----"

میں نے اسے بڑی عاجزی سے کہا۔

پراچہ اب واقعی سنجیدہ ہو گیا تھا---- شاید اسے میری حالت پر رحم آرہا تھا اور دل ہی دل میں شاید وہ میرے پاگل پن پر ہنس بھی رہا تھا۔

"دیکھو یار حنیف باؤ ---- میری بات سن کر تمہیں دکھ تو بہت ہو گا لیکن ہے سچی بات ---- میں تو ہر طرح حاضر ہوں ---- میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دے سکتا ہوں کہ اگر نوری اس گناہ کی دنیا سے نکلنا چاہے تو الماس بائی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گی۔ میں خان صاحب کی بھی منت سماجت کر کے انہیں منا لوں گا---- لیکن مجھے لگتا نہیں کہ ایسا ہو ---- میں بھی زندگی میں اس کیفیت کا شکار رہا ہوں جس سے تم گزر رہے ہو ---- ان معاملات پر انسان دماغ کی بجائے دل سے سوچتا ہے ---- اور دل کی سوچ عموماً اسے گمراہ کر دیتی ہے ---- میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں بھی کہوں گا کہ تم نے نوری کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے ---- ایسی عورتوں کی نفسیات بڑی عجیب ہوتی ہیں وہ ایک مرد پر گزارہ نہیں کر سکتیں ---- الماس بائی نے اسے گھاٹ گھاٹ کا پانی پلا دیا ہے ---- برا نہ ماننا تمہارے پاس ایسا کوئی "سوشل اسٹیٹس" نہیں جو اس کے لیے باعث ترغیب ہو -----

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

شاید اسے میرے رد عمل کا انتظار تھا----

"پراچہ تمہاری بات ٹھیک ہو گی لیکن ایک مرتبہ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟" یار میں تمہیں کیسے سمجھاؤں"-----

میں نے بے بسی سے کہا۔

خدا جانے اس لمحے میرے لہجے میں کون سا دکھ سمٹ آیا تھا کہ پراچہ بھی متاثر

ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"ٹھیک ہے----- ٹھیک ہے----- جیسے تمہاری مرضی"-----

اس نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں اس سے ایک مرتبہ کہہ کر دیکھتا ہوں۔ شاید وہ مان جائے-----"

میں نے دوبارہ کہا۔

"یار باؤ حنیف میں نے کہا ناں کہ میں حاضر ہوں میں گارنٹی دیتا ہوں کہ الماس بائی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی-----"

پراچہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے آج مجھے اپنا بزنس پارٹنر بنا لیا تھا اور مستقبل میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چلنے کا وعدہ کر چکے تھے۔ پراچہ نے کہا تھا یہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہو لینے دو----- پھر تمہارے وارے نیارے کرا دوں گا۔



گھر آ کر میں نے اپنے والدین سے معافی مانگی اور انہیں جھوٹا سچا یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ میں اول تو گمراہ ہوا ہی نہیں تھا----- اگرچہ کچھ غلطیاں ہوئی بھی ہیں تو میں انشاءاللہ مستقبل میں انہیں نہیں دہراؤں گا-----

بے چاروں نے میری بات پر یقین کر لیا-----

شام تک کا وقت جیسے تیسے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے میں نے گھر میں گزارا اور پھر کسی کام کے بہانے سے استاد رنگی خان کے گھر کی طرف چل دیا۔

میں نے بڑی سنجیدگی سے فیصلہ کر لیا تھا کہ نوری کو اپنا کر اپنے والدین کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا اور مجھے امید تھی کہ میرے خلوص نیت کے سامنے اس کے گھر والے بھی ہتھیار ڈال دیں گے----- اپنی بات میں یقین پیدا کرنے کے لیے میں

نے اس کے والدین سے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اور یہی ارادہ لے کر اس کے گھر کی طرف جا رہا تھا-----

مجھے یاد آ گیا کہ چند ماہ پہلے بھی میں اس طرح احاطہ بیلی رام میں قسمت آزمائی کے لیے آیا کرتا تھا اور اپنی تدبیر و تزویر سے کامیاب ہو گیا تھا۔

مجھے اب بھی یقین تھا کہ کامیابی میرے قدم چومے گی کیونکہ اب تو میں جا بھی نیک ارادے سے رہا تھا۔ تب تو میرے عزائم بھی خطرناک تھے۔

لیکن----- میں یہ بات بھول گیا تھا کہ بعض دفعہ گھی واقعی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلا کرتا۔ اس کلی نگری میں آنے کے لیے اپنے منہ پر سیاہی ملنا ضروری ہوتا ہے یہاں کی ریت رواج یہاں کی رسمیں، یہاں کے قوانین یہاں کے مکینوں نے صدیوں پہلے اپنے لیے تراشے تھے اور آج تک بڑی ایمانداری سے ان پر عمل پیرا تھے-----

یہاں کا سچ وہ نہیں تھا جو ہماری دنیا کا سچ ہے۔ نہ ہی یہاں کا جھوٹ ہماری دنیا کے جھوٹ ایسا تھا----- یہ لوگ سچ جھوٹ ناپنے کے اپنے پیمانے رکھتے تھے-----

یہ کیسی دنیا تھی-----

تیور اور کومل کی دنیا-----

یہاں ہر پتنگ سے راگ پھوٹتے تھے۔

ان کی زندگی بھی وقت اور بے وقت کے راگ اور راگنیوں میں بٹی تھی-----

جب میں پہلی شام استاد رنگی خان کے آستانے پر گیا تھا تو مجھے کلیان ٹھاٹھ کا ایمن راگ شروع کروایا گیا تھا-----

میں یہ بھول چلا تھا کہ استاد رنگی خان نے تو اس روز مجھے اس دنیا کے نشیب و فراز سے ڈرا کر واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیا تھا۔

اس نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ گانا بڑا مشکل ہے۔ زندگی گزر جاتی ہے لیکن

گانا نہیں آتا۔ یہ تو میں بے وقوف تھا جس نے چند ماہ میں ہی سمجھ لیا تھا کہ میں زندگی کے گیت کو اپنے من کے تار پر اپنی مرضی سے گالوں گا-----

میں نے بڑے اعتماد سے استاد رنگی خان آرٹسٹ ریڈیو ٹی وی کے دروازے پر دستک دی تھی اندر سے حسب معمول استاد صاحب کی بیوی کی آواز سنائی دی "کون اے ----- آجاؤ -----"

میں نے مہم جو کی طرح اپنا پہلا قدم بڑی مضبوطی سے اندر رکھا اور اس کمرے میں آگیا جہاں استاد رنگی خان اس کی گھر والی اور دو تین رشتہ دار رہتے تھے -----

بسم اللہ ----- خیر ہوے ----- جی آیاں نوں ----- باؤ حنیف کہاں چلے گئے تھے تم"-----

استادنی نے میری شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"جی کہیں نہیں ----- پچھلے آٹھ دس دن سے کام بہت آگیا تھا"-----

میں نے انکساری سے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

"بچہ ریاض نہیں چھوڑنا ----- یہ کرت دریا بھی کرنے سے آتی ہے۔ گانا ریاض مانگتی ہے بیٹا ----- اسے ایک دن کے لیے چھوڑو گے تمہیں دس دن کے لیے چھوڑ جائے گا ----- بڑا اوترا شوق ہے بچہ ----- بڑی مشکل دنیا ہے ----- ایک مرتبہ کوئی بی اے، ایم اے کرلے ساری زندگی اس کو بی اے، ایم اے سمجھا جاتا ہے ----- اور یہاں کوئی پنڈت بن جائے، خان صاحب بن جائے، جگت استاد ہو جائے پھر بھی اسے ہر روز امتحان دینا پڑتا ہے ----- جب ساز سامنے رکھو گے امتحان شروع۔ ہائے ہائے، مر گیا میرا یار نتھو خان، کیا میدان گایا تھا اس نے کیا بلا کا گلا پایا تھا ----- اور تین روز بعد یار تین روز بھی کوئی وقت ہے ----- تین روز بعد جب "ولبھ" والے میدان میں بیٹھے تو گانا ہی بھول گئے ----- ہائے ہائے "آڑا چوتالہ" لگوانے والا نتھو خان الاپ میں ہی بے سرا ہو

گیا ----- سینڈھ سونڈھ میں نہیں باندھ سکا ----- بڑا رویا تھا یار ----- کہنے لگا رنگی خان بس ایک غلطی ہو گئی یہاں آنے سے پہلے اپنے باپ سے اجازت نہیں لی ----- استاد تھا ناں اس کا ----- باپ استاد ہی ہوتا ہے -----"

استاد رنگی خان نے افیم کھا رکھی تھی اور اپنی ترنگ میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

"یہاں سے چلے جایئے ----- مرجائیں ساری زندگی تو نے استادوں کی باتیں سنا سنا کر ہی گزار دی ----- کسی اور کی بھی سن لیا کر ----- دس بارہ روز بعد شاگرد گھر آیا ہے اور تو اپنا رونا لے کر بیٹھ گیا"-----

استادنی نے اسے ڈانٹ کر خاموش کروا دیا۔

استاد رنگی خاں نے نشے میں بڑے کام کی بات کہہ دی تھی ----- جس طرح نتھو خان باپ کی اجازت کے بعد "میدان" اترا اور ہار گیا تھا۔ اس طرح میں بھی میدان میں آگیا تھا۔ میں نے تو زندگی میں کوئی قدم باپ کی اجازت سے رکھا ہی نہیں تھا۔

میں تو خود کو دنیا کا سب سے عقل مند بندہ سمجھنے لگا تھا۔

اور آج -----

جب میں زندگی کی اہم ترین فیصلہ کرنے جا رہا تھا تو بھی میرے والد کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔

"چلو جی۔ چلو باؤ جی کو ریاض کرنے دو -----"

استانی نے وہاں موجود مفت بروں کو اٹھا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ میرے گھر میں آتے ہی آئے گی کچھ لوازمات لیں آئیں گے جن پر سوائے ان کے اور کسی کا حق نہیں جانتا تھا۔

استاد رنگی خان نے ہارمونیم سامنے رکھ لیا تھا -----

"کسی کو چائے کے لیے کہہ دیں"-----

میں نے اپنی دانست میں اپنی مستقبل کی ساس سے کہا۔

اوئے بشیرے کتھے مرگیاں جا چائے لا---- ساتھ کچھ کھانے کو بھی لے آنا"----

اس نے بشیرے سے کہا۔

میں نے حسب روایت سو کا نوٹ اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھا اور وہ "خیر ہووے خیر ہووے" کہتا چلا گیا۔

"ہاں جی ---- شروع کرو جی۔ بسم اللہ"----

استاد رنگی خان نے سر چھیڑا----

"استاد جی ۔ میں نے ایک بہت ضروری بات کرنی تھی"----

میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بیٹا---- کرو کرو---- خیر ہووے جے----"

استاد صاحب نے ہارمونیم پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔

"آپ بھی ادھر آجائیں"----

میں نے استانی کو بھی وہاں بلا لیا جو باہر چارپائی پر لیٹنے والی تھی۔

"ماں جی چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے---- آپ برا تو نہیں مانیں گے"----

میں نے اس کے بیٹھنے پر کہا۔

"ہائے ---- باؤ حنیف کیوں ہم غریبوں کو شرمندہ کر رہے ہو۔ کیا بات ہے؟"

اس نے بظاہر حیران ہو کر کہا۔

"ہاں جی---- استاد جی۔ دراصل میں نوری سے شادی کرنا چاہتا ہوں"----

میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا۔

"ہیں ں ں----"

استاد رنگی خان کو تو جیسے اچانک زبردست جھٹکا لگ گیا تھا۔

"بیٹا---- میں سمجھی نہیں"

گھاگ استانی کے کان کھڑے ہو گئے

"ماں جی میں نوری کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں"

میں نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

رنگی خان کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا لیکن ---- استانی کے لیے بلی کے بھاگوں ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنی زمانہ ساز نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور وہاں میدان ہموار پا کر اگلا حملہ کر دیا۔

"حنیف بیٹا---- تم سمجھتے بھی ہو کیا بات کہہ دی ہے تم نے ---- کہاں تم لوگ اور کہاں ہم کمینے لوگ"----

"ماں جی ---- میں ذات پات پر یقین نہیں رکھتا----"

میں نے حوصلہ کیا۔

"بیٹا---- تمہارے یقین نہ رکھنے سے کیا بنے گا۔ سارا زمانہ یقین رکھتا ہے۔ آخر تم نے اس دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے کہ جنگل میں تو رہنا نہیں"۔

استانی نے اپنی دانست میں سنجیدگی اختیار کی۔

"دیکھئے ماں جی ---- میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کی ہے ---- تمام حالات کا جائزہ لے کر اور آنے والے وقت کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا ہے۔ مجھے امید ہے میرے والدین اس کی اجازت دے دیں گے اور نوری کو بطور دلہن کے قبول کر لیں گے۔ آخر میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ اس دنیا میں میری علاوہ ان کا اور ہے ہی کون ---- پھر ہمارے تو قریبی رشتہ دار بھی نہیں ہیں---- پھر کسی نے کیا اعتراض کرنا ہے ---- اور پھر کوئی اعتراض کرتا ہے تو کرتا رہے کسی کی پرواہ نہیں"----

میں نے تقریر شروع کر دی۔

ہوشیار اور زمانہ ساز بوڑھی میراشن میرے "جذبہ شوق شہادت" کا بار بار یقین کرنے کے بعد بالآخر مجھے چھرے تلے دینے کا فیصلہ کر لیا-----

"حنیف بیٹا----- ہماری تو خوش قسمتی ہو گی----- تم جیسا پڑھا لکھا اور برسر روزگار داماد قسمت والوں کو ہی نصیب ہو سکتا ہے----- لیکن ہماری کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے ہم بری طرح پھنسے ہوئے ہیں"-----

اس نے اپنا داؤ پھینکا۔

"کیا؟"

میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"بیٹا ہمارے حالات تیرے سامنے ہیں۔ پہلے تو استاد صاحب کو ریڈیو ٹی وی پر کوئی پروگرام وغیرہ مل جایا کرتا تھا۔ لیکن چار پانچ سال سے جب سے یہ اسلامی حکومت آئی ہے وہ سلسلہ بھی ختم ہے۔ ہم ماں بیٹی گا بجا کر کیا کما لیتے ہوں گے----- مہنگائی تمہارے سامنے ہے----- الٹا استاد صاحب کو روزانہ چالیس پچاس روپے نشہ کے لیے چاہیئے----- بیٹا ہم الماس بائی کے قرض دار ہیں اور جب تک اس کا قرض نہیں چکاتے ہم کسی بھی لحاظ سے نوری کو وہاں جانے سے نہیں روک سکتے----- یوں بھی ہمارا سارا گھر بار نوری کی کمائی پر ہی چل رہا ہے----- اگر اس نے الماس بائی کی نوکری چھوڑ دی تو ہم سب مارے جائیں گے۔ ہم تو پہلے ہی آٹے دال کے محتاج ہیں"-----

اس نے سارے زمانے کی مظلومیت اپنے چہرے پر جمع کرتے ہوئے کہا۔

"ماں جی----- کتنا قرض ہے اس کا"-----

میں نے نوابوں کی طرح پوچھا۔

"بیٹا پیسہ آتا ہے کیڑی کی رفتار سے اور جاتا ہے آندھی کی طرح----- مہنگائی تمہارے سامنے ہے۔ نوری کے بھائی کے علاج پر اچھے خاصے پیسے لگتے ہیں-----

میرے خیال سے دو ماہ پہلے اس کے ایک لاکھ اور کوئی تین چار ہزار روپے چڑھ چکے تھے-----"

اس نے رقم الفاظ چباتے ہوئے بتائی تھی-----

"ماں جی----- میں کسی نہ کسی طرح اس کا قرض اتار دوں گا-----"

میں نے بڑے اعتماد اور امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا----- جب ہم اس کا قرض اتار دیں گے پھر ہی نوری کو تمہیں سونپ سکتے ہیں"۔ اس نے بظاہر بڑی مظلومیت دکھائی۔

اس درمیان استاد رنگی چپ چاپ بڑے انہماک سے ہماری باتیں سنتا رہا آخری مرحلے پر اس نے گفتگو میں حصہ لیا۔

"بیٹا----- ایک التجا ہے ہماری بھی خدا کے واسطے ابھی اس بات کی کسی کو کانوں کان ہوا نہ لگنے دینا۔ اگر خدا نخواستہ یہ بات ہماری برادری میں کسی نے سن لی تو ہم مارے جائیں گے----- "الماس بائی کو تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں"-----

اور استاد جی----- آپ بے فکر ہو جائیں۔ اور جہاں تک الماس بائی کا تعلق ہے جب وقت آئے گا تو اسے بھی دیکھ لیں گے----- اتنا ڈرنے والی بھی کوئی بات نہیں ہے"-----

میں نے شوخی سے اکڑتے ہوئے کہا۔

"بیٹا اللہ تجھے زندگی دے میرا مولا----- غریب کی بچی کو لگائے گا ساری زندگی تجھے دعائیں دیں گے۔ بس بیٹا تو جلدی رقم جمع کر----- میں اس کے منہ پر ماروں اور تیری امانت تیرے حوالے کریں"-----

استادنی نے میری کمر تھپتھپائی بالکل یوں جیسے کسی کو "چڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا" کہا کرتے ہیں۔

چور کی داڑھی میں تنکا-----!

گو کہ الماس بائی پر اس کا داؤ آزما کر میں نے ایک مرتبہ تو اپنا الو سیدھا کر لیا تھا۔

لیکن ----- یہ بات میں بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ سیاسی قسم کی طوائف ہے اور اپنی اس ہزیمت کا ضرور بدلہ چکائے گی۔ کرائم رپورٹر پراچہ میرا ہمراز بن چکا تھا۔

لیکن ----- میں اس کی طاقت کی حدود کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا----- وہ اپنے صحافتی اثر و رسوخ سے ایک حد تک ہی کام کروا سکتا تھا۔ اس میں سب سے مضبوط اور اچھی زبان پیسے کی زبان تھی۔ جس کے بعد پھر غنڈہ گردی اور یہ دونوں کام ایم پی اے خان صاحب سے اچھے کوئی نہیں کر سکتا تھا-----

میں نے اس رات جو مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے تھے ان کے بعد سے میرا تو اس سسٹم پر سے ایمان ہی اٹھنے لگا تھا۔

اب مجھے دن رات اسی بات کی فکر تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو الماس بائی کا قرضہ اتارا جائے تب ہی نوری آزاد ہو کر میری بانہوں میں سما سکے گی----- اس کے بغیر کم از کم اس کا الماس بائی کے چنگل سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔

میں کسی بھی طرح الماس کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا-----

یہی سوچ تھی جس نے مجھے الماس بائی سے کوٹھے پر پہنچا دیا-----

لیکن ----- حیرت انگیز طور پر میں نے اس کے رویے میں معمولی سا فرق بھی نہیں دیکھا۔ وہ بڑی زمانہ ساز عورت تھی اور میری توقعات سے بڑھ کر ہوشیار ----- شاید ابھی اسے مجھ سے اور کام بھی لینے تھے -----

لیکن ----- اس کے اصرار کے باوجود اس روز میں نے "کوکا کولا" پینے سے انکار کر دیا۔

"ہائے اللہ ----- کیا ہو گیا تمہیں باؤ حنیف -----"

اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ----- اس کی کچھ میڈیکل وجوہات ہیں ----- برائے مہربانی مجھے دوبارہ مجبور نہ کرنا"-----

میں نے اس سے درخواست کی۔

"اچھا تو نہیں لگتا----- خیر تمہاری مرضی-----"

اس نے کہا اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہاں خان صاحب آ گئے۔

"یار تم سے ایک کام نکل آیا ہے"-----

انہوں نے میرے احوال دریافت کرنے کے بعد کہا۔

"حکم کریں خان صاحب"-----

میں نے سراپا انکسار ہو کر پوچھا۔

"گھبرا نہ جانا ----- ہم اپنے بندوں کو برے وقت میں سنبھالتے بھی ہیں ----- دیکھو فائل کے معاملے میں تمہاری طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ----- اب بھی کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یہ جس سے دوستی کرتے ہیں آخر تک نبھاتے ہیں اور دشمنی بھی-----"

خان صاحب نے میرے آنکھوں میں جھانک کر آخری فقرہ ادا کیا۔

یہ میرے لیے ایک طرح سے میسج تھا۔۔۔۔

"خان صاحب ہم آپ کے تابعدار ہیں۔۔۔۔ آپ حکم تو کریں۔ تعمیل ہو گی"۔

میں نے سوچا خان صاحب کی براہ راست چمچہ گیری کا موقع کیوں ہاتھ سے گنواؤں۔ آخر الماس بائی ہی میرے اور اس کے درمیان کیوں حائل ہے۔۔۔۔

کمرے میں ہم دونوں اکیلے تھے۔۔۔۔

خان صاحب نے اپنے سامنے دھرا بریف کیس کھولا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

"یہ اٹھالو۔۔۔۔"

اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"لیکن سر!"

میں جھجک رہا تھا اچھی خاصی رقم تھی اور پھر نجانے وہ کیا کام کہہ دے۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں اٹھالو۔۔۔۔"

اس نے اس لہجے میں نے بے اختیار نوٹوں کی گڈی اٹھالی۔

"انہیں گنتی کرو۔۔۔۔"

اگلا حکم ملا۔

مجھے لگا جیسے خان صاحب نشے میں ہوں حالانکہ وہ نشے میں نہیں تھا۔ بالکل ہوش و حواس میں بات کر رہا تھا میں نے نوٹ گننے شروع کیے۔ ہزار ہزار کے پچاس نوٹ تھے۔

"لے لو باؤ حنیف۔۔۔۔ تیرا کام تو بن گیا۔۔۔۔ ہیروئن اب تیری ہو گئی۔ پہلی قسط ہی اتنی بڑی دیکھ کر استاد رنگی خان نوری کو میرے ساتھ بھیج دیں گے۔۔۔۔"

میں نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے سوچا۔

"پچاس ہزار ہیں خان صاحب"۔۔۔۔

میں نے خان صاحب سے کہا۔

"پچاس ہزار بقایا کام کے بعد ملیں گے"۔۔۔۔

خان صاحب نے میری طرف جھکتے ہوئے اپنی بائیں آنکھ دبائی۔

"اب سسپنس بھی ختم کر دیجئے "خان صاحب"۔۔۔۔

میں نے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ اب تو نوری مکمل میری ہونے والی تھی۔ یہ تو بیٹھے بٹھائے مفت ہی کام ہو رہا تھا۔۔۔۔

"دیکھو یار حنیف میں بھی روز روز تمہیں تکلیف دیتا اچھا نہیں لگتا کہ فلاں فائل لاؤ۔۔۔۔ فلاں کی نقل لاؤ۔۔۔۔ آخر یہ دھندہ کب تک چلے گا۔۔۔۔ میں نے سوچا ایک ہی مرتبہ سارا ٹنٹنا ختم کر دوں۔۔۔۔ یار اصل میں تمہارے ریکارڈ روم میں بہت سی فائلیں ایسی پڑی ہیں جن میں ہم نے بھلے وقتوں میں ہیرا پھیری کروائی تھی۔ آج کل حکومت کو نیا دورہ پڑا ہے کہ پرانے کرپشن کے کیس نکالنے کا۔۔۔۔ خاص طور سے تمہارے افسر اعلیٰ کو کچھ زیادہ ہی تکلیف ہے۔۔۔۔ اگر اس نے پرانی فائلیں پڑھنی شروع کر دیں تو نجانے میرے جیسے کتنے غریب بے گناہ مارے جائیں گے پھر جو کام ہو چکا ہے اسے دوبارہ خراب کرنا۔۔۔۔ یار! یہ گڑھے مردے اکھاڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔۔۔۔ میں نے کہا تمہیں بار بار تکلیف دینی ہے۔۔۔۔ وہ کیا ہے کہ سو دن چور کا اور ایک دن شاہ کا۔۔۔۔ کسی دن خدا نخواستہ رنگے ہاتھوں ہی نہ پکڑے جاؤ۔۔۔۔ بگڑے گا تو کچھ نہیں تمہارا اُس لیکن سالے کسی اور دفتر میں تبادلہ ہی کروا دیں گے۔۔۔۔ تم یوں کرو کہ اپنے ریکارڈ روم کو آگ لگا دو۔۔۔۔ نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری۔۔۔۔ پھر نکالتے پھریں ہیرا پھیریاں اور فراڈ کے کیسوں کی فائلیں راکھ کے ڈھیر سے۔۔۔۔"

خان صاحب نے ایسی بات مکمل کر کے شیطانی قہقہ لگایا۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلتا سیسہ انڈھیل دیا ہو -----

خان صاحب مجھے ایسے خطرناک کام کے لیے آمادہ کر رہا تھا جس کے تصور سے ہی میں لرزاں تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ خان صاحب مجھ سے اس نوعیت کی تخریب کاری بھی کروائیں گے -----

خدا کی پناہ -----

مجھے اپنے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی دکھائی دے رہی تھی -----

"خان صاحب مم میں ----- میں -----"

"کم پیسے ہیں کیا؟ ----- یار اتنا لالچ بھی اچھا نہیں ہوتا ----- کوئی بات نہیں۔ پانچ دس ہزار اور دے دیں گے -----

خان صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے اس طرح کہا جیسے اسے علم نہ ہو کہ میں حقیقت میں کیا چاہتا ہوں حالانکہ وہ جان گیا تھا کہ میں خوفزدہ ہوں۔

"دیکھئے خان صاحب ----- چھوٹے موٹے کام تو میں کر سکتا ہوں لیکن اتنا بڑا کام ----- مجھے معاف ہی کر دیں۔" میں نے گھبراہٹ میں باقاعدہ ہاتھ باندھ دیے۔

"اوہو ----- یار حنیف باؤ تم تو یونہی گھبرا رہے ہو ----- یار تم نے کرنا کیا ہے۔ بس ہم ایک پٹاخہ دیں گے اسے ریکارڈ روم میں رکھ دینا ----- دفتر بند ہونے کے بعد وہ پھٹ جائے گا اور وہاں آگ لگ جائے گی ----- تمہارا اس میں کیا لگے گا؟ ----- تم تو خواہ مخواہ ہی گھبرا رہے ہو ----- یہ لو اپنا پسینہ پونچھ لو -----"

خان صاحب نے ٹشو پیپر کا ڈبہ میری طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا دیا۔

میں نے محسوس کیا واقعی مجھے پسینہ آگیا تھا -----

"دیکھئے خان صاحب آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے ----- میں یہ نہیں کر سکتا"-----

میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ابھی سوچ لو ----- پیسے رکھو ----- ہم جو رقم دے دیں وہ واپس نہیں لیا کرتے۔ کام البتہ ضرور ہونا چاہئیے ----- رکھو رکھو شاباش ابھی تم ایک دو دن سوچو ----- پھر ہم بات کر لیں گے ----- اچھا میں چلوں ----- آج تو میٹنگ بھی بڑی اہم ہے ----- الماس بیگم -----

وہ میری طرف دیکھے بغیر الماس بائی کو پکارتا اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ بڑا خطرناک نفسیاتی حربہ اس نے آزمایا تھا -----

یہ آدمی تھا خبیث اس کا اندازہ مجھے آج ہی ہوا تھا -----

خدا جانے ان کی کیا پلاننگ تھی کہ جیسے ہی میں خان صاحب دوسرے کمرے میں پہنچا بمشکل دو تین منٹ بعد نوری ہاتھ میں ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

"ہائے اللہ ----- مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں ----- کبھی ہمارا حال بھی پوچھ لیا کریں ----- اتنے اتنے فیشن چلے ہوئے ہیں اور میرے پاس ڈھنگ کا ایک کپڑا بھی نہیں"-----

اس نے مشروبات کی ٹرے ایک طرف رکھ کر میرے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کی اس حرکت نے مجھے قدرے نارمل کر دیا۔ ورنہ خوف سے میری گھگی بندھی ہوئی تھی۔

نوری بھی الماس بائی کی شاگرد تھی -----

الماس بائی نے اس کا استعمال بڑا شاندار رکھا ہوا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے میری کمزور نبضیں دبانا شروع کیں اور اپنا مقصد حاصل کر لیا۔

"کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں"-----

اس نے اچانک ہی پوچھا۔

"نہیں نہیں ----ایسی تو کوئی بات نہیں-----"

میں نے اسے ٹرخانا چاہا۔

لیکن ----- وہ تو آئی ہی کسی اور مشن پر تھی۔

"حنیف باؤ---- اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی پردہ تو رہ نہیں گیا۔ اپنی محبوبہ اور بیوی کو دل کی بات نہیں بتاؤ گے تو اور کسے بتاؤ گے؟

اس نے بڑے سوگوار لہجے میں کہا۔

"نوری ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یونہی ایک پریشانی ہے"-----

میں نے دبے دبے لفظوں میں اس کے لہجے سے متاثر ہو کر کہا۔

"پریشان ہوں آپ کے دشمن۔ جہنم میں گیا کام ----- لیکن مجھ پر اعتبار تو کر کے دیکھیں ----- آخر میں آپ کی کچھ لگتی ہوں"-----

اس نے دوبارہ مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

"نوری ----- دراصل بات یہ ہے کہ خان صاحب مجھ سے ایک بڑا مشکل کام لینا چاہتے ہیں جو میرے بس میں نہیں ہے -----"

میں نے گول مول سی بات کی۔

"کتنے پیسے دے رہے ہیں"-----

اس نے اچانک ہی بڑا عجیب سا سوال کر دیا۔

"ایک لاکھ دیں گے"-----

گھبراہٹ میں ہی میرے منہ سے نکلا-----

"حنیف باؤ ----- اس دنیا میں کون سا کام ناممکن ہے اگر ایک لاکھ مل جائے تو مجھے اس غلامی سے چھٹکارا مل جائے گا ----- خدا کے لیے تم جیسے بھی ممکن ہے یہ کام کر لو

-----ایک مرتبہ ہم یہاں سے نکل جائیں پھر باقی معاملات بھی دیکھ لیں گے"-----

اس نے مجھے ترغیب و تحریص سے جال میں پھانس لیا۔

میں واقعی سوچ میں پڑ گیا-----

"ٹھیک ہے----- میں دیکھوں گا----- اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آج کل گھر وقت پر پہنچنا پڑتا ہے-----"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے نوٹ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں اڑس لیے تھے اور اب اپنے گھر کی طرف پیدل معمول کے مطابق جا رہا تھا۔

رات کا پہلا پہر تھا-----

شہر کی ان تنگ گلیوں میں تو دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔ رات کی تو بات ہی اور تھی۔ بلدیہ کی مہربانی سے یہاں سٹریٹ لائٹ کا وجود ہی ناپید تھا۔ رات کو ان گلیوں میں وہ آدمی سفر کر سکتا تھا جو یہاں کے اونچ نیچ سے واقف ہو۔

عام شخص کے لیے ان ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں چلنا رات کا کار دار تھا۔ کسی بھی وقت ٹھوکر لگتی اور وہ منہ کے بل گرتا۔

میں اس وقت محلے کی "اندھی گلی" سے گذر رہا تھا۔

اس کا نام اندھی گلی شاید اس لیے رکھا گیا ہو گا کہ یہاں دن کو بھی اندھوں کی طرح اندازے سے چلنا پڑتا تھا۔

میرے لیے چونکہ یہ معمول کی بات تھی اس لیے میں بظاہر آرام سے جا رہا تھا۔

البتہ ایک بات مجھے رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی کہ میں نے بہرحال خان صاحب کے پچاس ہزار روپے اپنی جیب میں ڈال لیے ہیں-----

مجھے فلموں کے وہ مناظر یاد آ گئے جب بدمعاش لوگ کسی کام کی "سپاری"

پکڑتے ہیں تو انہیں وہ کام کرنا ہی ہوتا ہے بصورت دیگر اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے بھی خان صاحب سے اس کام کی "سپاری" پکڑ لی ہے۔

یہی سوچتا میں قدرے پریشانی کے عالم میں جا رہا تھا جب اچانک مجھے یوں لگا جیسے اندھی گلی روشن ہو گئی ہو۔

یہ اس زور دار ضرب کا کمال تھا جو کسی آہنی سریے سے میرے سر پر لگائی گئی تھی اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ستارے پھوٹنے لگے تھے۔ میں ایک ہی ضرب سے چکرا کر گر پڑا۔ گرنے سے پہلے کا آخری منظر میں نے یہی دیکھا کہ تین ہیولے آسیب کی طرح میری طرف بڑھ رہے تھے-----



مجھے کب ہوش آیا-----

یہ کون سا ہسپتال تھا۔

اس کی خبر بعد میں ملی----- میری خوش قسمتی تھی کہ جس مکان کے سامنے مجھ پر حملہ ہوا اس کے مکینوں نے اچانک ہی کسی کام سے دروازہ کھولا اور مجھے اس طرح زخمی دیکھ کر باقی محلے داروں کو آوازیں دے کر اکٹھا کیا۔ جنہوں نے مجھے ہسپتال پہنچایا۔ ان لوگوں میں سے کوئی مجھے جانتا ہو گا جس نے میرے گھر والوں کو اطلاع دے دی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے سرہانے میری والدہ، بہن اور عابدہ کھڑی تھیں۔ شاید وہ بھی میرے زخمی ہونے کی خبر سن کر ان کے ساتھ ہی یہاں آ گئی تھیں-----

"یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

میرے ہوش میں آنے پر والدہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

میں خاموشی سے ایک ٹک انہیں دیکھتا رہا---- شاید ڈاکٹروں نے مجھے کوئی خواب آور دوا پلائی ہوئی تھی جس کے اثر سے میں نیم خوابیدہ سا ہو گیا تھا۔

لیکن -----

میرا دماغ بالکل ٹھیک کام کر رہا تھا---- اور اس احساس نے میرے دماغ میں آتش فشاں سلگا دیا تھا کہ میری جیب میں خان صاحب کی دی ہوئی "سپاری" کوئی اور لوٹ کر لے گیا ہے۔

اصولی طور پر میرا دماغ فوراً جیدے کی طرف جانا چاہئے تھا۔"

لیکن ----- نہیں۔ مجھے کسی نادیدہ قوت نے مطلع کر دیا کہ میرے ساتھ بہت بڑی دھوکہ دہی کی واردات ہو گئی ہے۔

خان صاحب یونہی مجھ سے پیسے واپس نہیں لے رہا تھا---- بلکہ اس کے پس پردہ اس کا شیطانی ذہن کار فرما تھا۔ اس نے پہلے نوری کے ذریعے مجھے قابو کرنا چاہا تھا اور یہ دیکھ کر کہ نوری بھی سوفی صد نتائج حاصل نہیں کر سکی میرے ساتھ یہ واردات کروا دی تھی۔

اس علاقے میں گزشتہ چالیس سال میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا تھا----

میں کوئی ایسا صنعتکار نہیں تھا۔

کوئی بہت بڑا بزنس مین نہیں تھا۔

آخر مجھ میں ایسی کون سی بات تھی جس نے ان ڈاکوؤں کو میری طرف راغب کیا۔

میرے تو گلے میں عام نوجوانوں کی طرح سونے کی زنجیر بھی نہیں پڑی تھی-----

اور -----

حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ حملہ آوروں نے میرے ہاتھ سے گھڑی بھی نہیں

اتاری تھی۔ البتہ میری جیبیں خالی کر گئے تھے۔

یہ خان صاحب کے شیطانی دماغ کا کرشمہ تھا۔

اس نے اب مجھے اصولی طور پر پابند کر دیا تھا کہ میں اس کے حکم کی تعمیل کروں ---- بصورت دیگر اس کی دشمنی مول لینے کے لیے تیار رہوں جس کا کم از کم میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میری حالت ایسے بد قسمت شکاری جیسی تھی جس کے سامنے اژدھا پھن پھیلائے کھڑا ہو اور پیچھے شیر منہ پھاڑے اس کی طرف بڑھ رہا ہو-----

اف میرے خدایا ----- کیا کروں ----- کدھر جاؤں؟

زندگی میں اس روز پہلی مرتبہ مجھے بے ساختہ خدا کی یاد آئی۔ ساری زندگی میرا باپ مجھے سمجھاتا رہا کہ انسان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کچھ نہیں اور وہی انسان کا آخری سہارا ہے ----- خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو بھلے وقت میں اللہ کو یاد کر لیں ----- وگرنہ برے وقت میں تو پھر اس سے مدد مانگنی ہی پڑتی ہے -----

میرے سر میں چوٹ کا اثر کم اور اس حادثہ جانکاہ کا اثر زیادہ تھا جس نے میرے اعصاب کو شل کر دیا تھا۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی مرضی سے ہل بھی نہیں سکتا---- اس بے بسی نے شاید میری آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے۔

اور -----

میری بدلتی کیفیات کو شاید عابدہ نے سب سے زیادہ محسوس کیا تھا۔

"حنیف باؤ ----- گھبراؤ نہیں---- اللہ نے خیر کر دی ہے ---- ایکسرے آ گیا ہے ---- ہڈی پر چوٹ نہیں لگی ---- ٹانکے لگے ہیں پانچ چار روز میں آرام آجائے گا-----

اللہ تعالیٰ ان خبیثوں کا بیڑہ غرق کرے جنھوں نے تم پر حملہ کیا تھا"-----

عابدہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے احساس ندامت ہوا-----

میرے ضمیر نے مجھے یوں جھنجھوڑا جیسے جامنوں کو مٹی کے پیالے میں ڈال کر پھل فروش جھنجھوڑا کرتے ہیں میں نے سوچا کہ میں بڑا ظالم انسان ہوں۔ دانستہ یا نادانستہ میں نے عابدہ پر بڑا ظلم کیا تھا---- میں نے اس کی پاکیزہ محبت کو ٹھکرا کر ایک زمانے کی گندگی اپنے منہ پر مل لی تھی۔

میں روسیاہ تھا-----

آج جب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ دراصل وہ قدرت کا انصاف تھا۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے مولوی صاحب جیسے ایماندار' بااصول اور نیک باز کے ہاں مجھ ایسا بدکردار اور گندہ بیٹا پیدا کیا تھا۔

اس کے برعکس دینو پہلوان اور اس کی بیوی داری نے گندگی کا جو جوہڑ بنا رکھا تھا۔ اس میں عابدہ کنول کا پھول تھی-----

ایک نیک سرشت انسان کی کوکھ سے جنم لے کر میں بدطینت ہو گیا تھا-----

اور-----

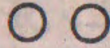
وہ ایک بدبخت اور گمراہ کرانے کے لیے خوش بختی کی علامت بن گئی تھی۔

عابدہ میری چارپائی کا ایک کونا پکڑے مجھ پر یوں جھک کر کھڑی تھی جیسے اگر وہ سیدھی ہوئی تو مجھے کہیں تکلیف نہ شروع ہو جائے۔ ہسپتال میں بیڈ کے ساتھ دھرے لکڑی کے چھوٹے سے بنچ پر اس نے دوسری طرف میری والدہ اور بہن کو زبردستی بٹھایا ہوا تھا-----

میری ماں نے بعد میں بتایا کہ وہ ہی بھاگ دوڑ کر کے میرے لیے دوائیاں لاتی رہی ہے۔ کیونکہ والد صاحب تو دو روز پہلے یہ خوشخبری ملنے پر کہ ان کا بیٹا راہ راست پر آگیا ہے تبلیغی مشن پر جا چکے تھے ----- انھیں تو اب تیرہ دن کے بعد گھر واپس لوٹ کر آنا تھا۔

وہ تو خدا کا شکر تھا کہ عابدہ گھر پر موجود تھی جب یہ اطلاع ملی ورنہ میری ماں اور بہن تو رو رو کر ہی مرجاتیں ---- وہ تو اس وقت ہم سب کی ماں بنی ہوئی تھی -----

"بیٹا ---- میں تو مرتے دم تک اس کے احسان کا قرض نہیں اتار سکتی ----- خدا کرے میری بیٹی بھی ایسی ہی ٹھیک ہو ---- ایسی ہی خدمت گزار اور قسمت والی ہو-----"



میری ماں نے مجھے کہا تھا۔

میں چند ثانیے اس کے چہرے کی طرف ایک ٹک دیکھتا اور اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتا رہا۔ پھر عالم ہوش میں واپس لوٹ آیا۔

"بیٹھ جاؤ عابدہ-----"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں جوس لاتی ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا تمھیں جوس اور دودھ پلائیں"-----

وہ میرے ایک فقرے پر ہی خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

"عابدہ تم بیٹھ جاؤ۔ مجھے اس طرح تکلیف ہوتی ہے"-----

میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"ہائے باؤ حنیف اللہ نہ کرے تمھیں تکلیف ہو۔ بس اب تم بالکل ٹھیک ہو۔

جوس پیو اور گھر چلو پتہ ہے رات سے خالہ جی کتنی پریشان ہیں۔

اس نے خوشی اور ذمہ داری کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے -----"

میں نے جیسے ہار مان لی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گئی اور بازار سے مالٹوں کا جوس نکلوا کر لے آئی۔ اس درمیان میری ماں مسلسل اس کے لیے رطب اللسان رہی۔

"لڑکی کیا ہے بیٹا فرشتہ ہے فرشتہ۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ داری کی اولاد ہے-----

وہ بار بار یہی کہے جا رہی تھی۔

میں نے اپنی ماں کے بار بار سوال کرنے پر بھی ایک ہی جواب دیا کہ مجھے حملہ آوروں کا علم نہیں شاید میں غلط فہمی میں مارا گیا ہوں۔

اب انہیں حقیقت کیا بتاتا اور کیا کہتا؟

مجھے تو علم تھا میری ساتھ کیا قیامت بیت گئی ہے اور اس کے بعد میرے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔

عابدہ نے میری والدہ کو زبردستی گھر یخنی بنانے بھیج دیا تھا۔ میری والدہ کی روانگی کے کچھ دیر بعد ہی دینو پہلوان وہاں آگیا۔

"اوہ شہزادے کیا چکر ہے بھئی ----- میرا مطلب ہے حملے وغیرہ ہو رہے ہیں"-----

اس نے اپنے مخصوص انداز سے کہا۔

"ابا جی ----- موقعہ محل تو دیکھ لیا کریں۔"-----

عابدہ کے لیے شاید اپنے باپ کا یہ انداز اس وقت قابل برداشت نہیں رہا تھا۔

"اوہ میرا مطلب ہے شہزادے فکر نہ کر غم نہ کر ----- ایک مرتبہ بندوں کی

نشاندہی کروا دے میں گدی سائیں بادشاہ سے کہہ کر ایسا حشر نشر کرواؤں گا کہ دنیا تماشا دیکھے گی"۔

اس نے دوبارہ کہا۔

"پہلوان جی آپ کا بہت شکریہ -----"

میں نے اٹھ کر بیڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

شہزادے مجھے تو یہ جیدے کا چکر ہی لگ رہا ہے"-----

اچانک ہی اس نے میرے کان کے نزدیک سرگوشی کے انداز میں کہا۔

میں جانتا تھا دینو پہلوان اپنی فطرت کے مطابق بات کا بتنگڑ بنا رہا ہے اور اب وہ چاہے گا کہ میں اپنی زبان سے جیدے کے متعلق کوئی ایسا جواب دوں جسے وہ اس تک منتقل کر کے اپنا الو سیدھا کرے۔

لیکن ----- میں خاموش رہا۔

کم از کم میں اس موذی کے ہاتھ اپنی کوئی کمزوری نہیں دینا چاہتا تھا-----

"نہیں پہلوان جی----- بھلا وہ ایسا کیوں کرے گا؟"

میں نے بمشکل کہا۔

"یار شہزادے سمجھا کر----- تو نے اس کا جو حال کیا تھا وہ یاد ہے تجھے؟"-----

پہلوان نے بڑے ہی منافقانہ انداز میں کہا۔

ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا گیا۔

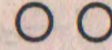
یہ بھی تو ممکن تھا کہ جیدے کے آدمیوں نے میرا تعاقب کیا ہو اور واپسی پر میرے ساتھ کچھ کر گزرے ہوں۔

لیکن ----- سیدھی سی بات ہے اگر اس نے حملہ کروایا تھا تو وہ لوگ میری تلاشی تو لیتے اور مار کر بھاگ جاتے۔ تلاشی لینے کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا تھا کہ یہ حرکت

خان صاحب نے کروائی ہے -----

میں نے پہلوان کی بات کا جواب نہیں دیا۔

اب محلے داروں کی آمد شروع ہو گئی تھی تھوڑی دیر بعد ہی مجھے پراچہ دکھائی دیا۔



پراچہ کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

وہ میری خیریت دریافت کرنے کے بعد ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور جب ملاقات کا وقت ختم ہونے پر تمام لوگ واپس لوٹ گئے تو میرے نزدیک آ گیا-----

عابدہ اس درمیان میرے اور میری تکالیف کے درمیان آہنی دیواروں کی طرح تن کر کھڑی تھی۔ کیا مجال جو اس نے میری بہن کو ذرا بھی اکیلے ہونے کا احساس ہونے دیا ہو۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں---- انشاء اللہ رات تک گھر چلا جاؤں گا"۔

میں نے جواب دیا۔

میرا جی تو چاہا کہ حقیقت حال بیان کر دوں -----

لیکن ----- ایک نادیدہ سے خوف نے میری زبان بند رکھی۔ اسے بتانے کا مطلب ہوتا کہ یہ بات میرے اور خان صاحب کے علاوہ ایک تیسرے شخص تک بھی پہنچ گئی ہے ---- میں تو اس گھناؤنے کام سے جو کرنے کا مجھے خان صاحب نے حکم دیا تھا۔ ایسا خوفزدہ تھا کہ اس سے متعلق سوچنا بھی میرے لیے تکلیف دہ ہو رہا تھا۔

یار سمجھ نہیں آتی ---- میری کسی کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟"

میں نے پراچہ سے کہا۔

"مجھے سمجھ آتی ہے حنیف باؤ میں گزشتہ سات سال سے ان کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ مجھے صرف ایک بات بتاؤ جس کے بعد میں تمہیں سب کچھ کچھ بتا دوں گا۔ تم نے خان صاحب کو کسی کام کے لیے انکار تو نہیں کیا؟"

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے ماہر تفتیشی افسر کی طرح سوال داغا۔

میں سنبھل کر بیٹھ گیا-----

"نہیں ---- یار پراچہ تجھ سے کیا پردہ؟ میری خان صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کل الماس بائی کے کوٹھے پر ہیلو ہیلو ضرور ہو گئی تھی"-----

میں نے جھوٹ بولا۔

"کہیں الماس بائی نے -----"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر اچانک ہی جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

"نہیں یار ----- الماس بائی بڑی خطرناک عورت ہے لیکن وہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہیں ڈالا کرتی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کی حالت تلملائی ہوئی کتیا جیسی ہے اور وہ تمہیں کاٹ کھانے کو بے چین ہو گی ---- لیکن نہیں ----- وہ بڑے ٹھنڈے دماغ کی طوائف ہے۔ ابھی تک تم خان کی نظروں سے نہیں گے اور خان کی نظروں میں آنے والے کسی بھی شخص کے متعلق وہ کسی غلط کام کا تصور ہی نہیں کر سکتی -----"

اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"پھر تو لے دے کر ایک ہی شخص رہ جاتا ہے جیدا-----"

میں نے کہا۔

"اسے بھول جاؤ۔ خان صاحب کے ذریعے اسے تمہارے معاملے میں "تھیرٹ"

مل چکا ہے وہ تمہاری ہوا کی طرف بھی ساری زندگی نہیں دیکھے گا؟"

پراچہ نے میری بات کی نفی کرتے ہوئے کہا پھر خود ہی کہنے لگا۔

"چلو چھوڑو ---- جو کوئی بھی ہے جلدی سامنے آجائے گا ----"

میں خاموش ہو گیا ----

پراچہ میرے لیے خاصا پھل فروٹ لے کر آیا تھا جو میرے نزدیک ابھی تک جوں کا توں پڑا تھا عابدہ نے ایک سیب اٹھایا اور کاٹ کر مجھے کھلانے لگی۔

"یہ کون ہے؟"

پراچہ نے اچانک ہی پوچھا۔

"عابدہ۔ والدہ صاحبہ سے قرآن پاک پڑھتی ہے۔ اللہ اس کا بھلا کرے بے چاری نے مجھے میری ماں اور بہن کو سنبھالا ہے" ----

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اتنے میں میری والدہ گھر سے میرے لیے یخنی تیار کر کے لے آئیں جو عابدہ نے مجھے سکول کی استانیوں کی طرح ڈانٹ ڈپٹ کر کے پلا دی۔

پراچہ بڑی حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس نے جان بوجھ کر عابدہ پر کوئی کومنٹ نہیں کیا تھا۔

آخر کرائم رپورٹر تھا۔

معاشرے کا نبض شناس ----

اس سے زیادہ کھرے اور کھوٹے کی شناخت اور کیسے ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے تسلی دینے کے بعد وہ چلا گیا۔ اس کے پہلے سوال ہی سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ ایم پی اے خان صاحب کی حرکت ہے۔

میرا جرم یہ تھا کہ میں نے ان کا کام کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔



جس کام کے تصور سے میں لرزاں تھا۔

اب مجھے وہ بہر صورت انجام دینا تھا۔ مجھے خان صاحب کے حکم پر تخریب کاری کرنی تھی۔ بھلے اس کی کچھ ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔

میرے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔

میں تخریب کار بننے جا رہا تھا ----

اخبارات میں چھپنے والے بڑے بڑے اشتہارات میری نظروں کے سامنے گزرنے لگے جن میں تخریب کاروں کی گرفتاری میں مدد کی اپیلیں کی گئی تھیں اور انعامات کا اعلان کیا گیا تھا ----

رات کو ہمیں ہسپتال سے چھٹی مل گئی ----

عابدہ کل رات سے اسی طرح اپنے قدموں پر کھڑی تھی اور اب ہمارے ساتھ ہی واپس گھر آئی تھی۔ میں نے اپنی والدہ سے درخواست کی تھی کہ کم از کم وہ اپنی زبانی والد صاحب کو اس حادثے کی اطلاع نہ دیں۔ باقی لوگ بھلے دیتے رہیں ----

ہسپتال میں پولیس والے آئے تھے۔ میں مجرموں کو جانتا تھا ---- لیکن ---- کتنا بے بس تھا کہ ان کا نام نہیں لے سکا۔

کاش میں اتنا بے بس نہ ہوتا۔

تین روز تک میں گھر پڑا رہا۔ اس درمیان دو مرتبہ الماس بائی نے اپنے ایک آدمی کو بھیج کر میری تیمارداری کروائی تھی۔

خان صاحب نے بطور خاص میرے لیے پانچ ہزار روپے اور پھول بھیجے تھے اور میری صحت یابی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔

اس درمیان میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک ہی دعا مانگی کہ کسی بھی طرح میرا تبادلہ یہاں سے کسی دوسرے دفتر میں ہو جائے۔

لیکن ----- میری بھی بد اعمالیاں اب اس حد تک بڑھ چکی تھیں کہ دعائیں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور باریابی کا شرف حاصل نہ کر سکیں۔

تیسرے روز جب میں گھر میں اکیلا تھا اور قدرے افاقہ محسوس کر رہا تھا تو ایک لڑکی بڑی سی چادر اوڑھے نجانے کس طرح لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر یہاں تک آ گئی۔

اس نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھایا تو میں چونک اٹھا۔

"نوری تم؟"-----

"حنیف باؤ-----"

وہ میرے ساتھ ٹسوے بہاتی لپٹ گئی۔

تب تو مجھے اندازہ نہیں تھا۔

لیکن ----- اب میں سوچتا ہوں کہ وہ بھی الماس بائی کی چال تھی۔ ان لوگوں نے نوری کو میرے لیے ٹرپ کا پتہ بنایا ہوا تھا اور جب اپنا پلڑہ ہلکا ہوتا دیکھتے "ٹرپ چال" چلا دیتے۔ میں نے آہستگی سے اسے خود سے الگ کیا۔

نوری نے باقاعدہ آنسو بہانے شروع کر دیے۔ وہ بڑی محبت سے میرے جسم کے بار بار بوسے لے رہی تھی۔ شاید مجھے باور کروانا چاہتی تھی کہ دنیا میں اس سے زیادہ کوئی مجھ سے محبت نہیں کر سکتا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ حنیف باؤ۔ میں اس کنجر کے اپنے ہاتھ سے ٹوٹے کروں گی-----
تم ٹھیک ہو جاؤ"-----

اس نے مجھے بتایا کہ جب سے اس کے والدین کو اپنے ہونے والے "جمائی" پ

حملے کی خبر ملی ہے ان کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی ہے وہ تو یہاں آنا چاہتے تھے"۔

لیکن ----- نوری نے انہیں روک دیا۔

ایک مرتبہ پھر شیطان مردود نے مجھے گمراہ کر دیا۔

ایک مرتبہ پھر میں ساون کا اندھا بن گیا۔ مجھے چہار سو نوری ہی نوری ہریالی کی صورت دکھائی دینے لگی۔

ایک مرتبہ پھر میرے دماغ میں باؤ امین کے گھر دیکھی فلم چلنے لگی-----

نوری بڑی کامیاب اداکاری کر رہی تھی۔

وہ بات بات پر آنسو بہاتی میری چارپائی سے لپٹ کر بیٹھ جاتی، بالآخر میرے منع کرنے پر وہ آنکھوں سے آنسو بہاتی واپس لوٹ گئی۔

میں نے ایک مرتبہ اور اپنے آپ سے عہد کیا کہ نوری کو بہر صورت حاصل کروں گا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

دس روز تک میں بستر پر رہا۔

اس درمیان قریباً ہر روز خان صاحب کا کوئی نہ کوئی کارندہ میرے دفتر کے ساتھی کے روپ میں مجھے خان صاحب کی طرف سے ملنے آتا رہا۔ وہ لوگ جان بوجھ کر مجھے کرید کرید کر حملہ آور کا نام پوچھتے اور میں لاعلمی کا اظہار کر دیتا۔

شاید وہ میرے خیالات جاننا چاہتے تھے۔

دو تین روز مزید آرام کرنے کے بعد میں دفتر چلا گیا۔ جہاں پہلے ہی خوف کی فضا بنی ہوئی تھی۔ تین چار نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ مجھے بھٹی صاحب کی زبانی علم ہوا کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے بہت سے لوگوں کا تبادلہ دوسرے دفتر میں کر دیا گیا ہے کیونکہ اس فائل کی چوری کا بڑا سخت نوٹس لیا گیا تھا۔

"بھئی بڑی پہنچ ہے تمہاری ----- انکوائری میں بھی تمہارا نام نہیں آیا اور اب تمہارا تبادلہ بھی کروا دیا گیا" بھٹی صاحب نے مجھے خوشخبری سنائی -----

"اوہ ----- میرے خدایا" -----

میں نے دل ہی دل میں کف افسوس ملا۔

کاش میں بھٹی صاحب کو بتا سکتا کہ یہ میرے لیے کتنی بری اور منحوس خبر تھی جو انہوں نے مجھے سنائی تھی۔ میں نے تو اللہ تعالیٰ سے رو رو کر اپنے تبادلے کے لیے

دعائیں مانگی تھیں۔ -----

اس کا مطلب یہ تھا کہ خان صاحب یہ شیطانی کارنامہ میرے ہاتھوں انجام دلانے پر تلا ہوا تھا۔ اور اسے میرے پل پل کی خبر تھی۔

بھٹی صاحب کے علاوہ ایک اور پرانا ساتھی اس کمرے میں باقی رہ گیا تھا -----

بھٹی صاحب بھی چونکہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھے۔ اس لیے انہیں یہاں رہنے دیا گیا تھا جب کہ دوسرا آدمی بالکل بے ضرر تھا۔

میں ان کی بات پر خاموش رہا۔ وہ میرا حال احوال اور حملے سے متعلق تفصیلات دریافت کرتے رہے اور میں نے ان کو بھی وہی جھوٹی کہانی سنا دی جو اس سے پہلے بہت سے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے سنا چکا تھا۔

"بس یار انسان کبھی کبھی غلطی میں بھی مارا جاتا ہے ----- اب یہی دیکھ لو۔ زندگی کے آخری حصے میں ہمارے منہ پر یہ کالک بھی مل جاتی تھی ----- تمہارے بعد بھی اب تک چار مرتبہ پولیس والے تھانے لے جا چکے ہیں۔ خدا جانے انہیں میری بات کا یقین کیوں نہیں آتا۔ تفتیشی افسر بضد ہے کہ فائل ہمارے ہی کمرے میں سے کسی شخص نے اڑائی ہے ----- کیونکہ وہ ہمارے ہی کمرے سے متعلقہ تھی۔ اللہ جانے کس گناہ کا دنیا سامنے آگیا ہے" -----

بھٹی صاحب نے بے بسی سے ٹھنڈی آہ لی۔

"اللہ خیر کرے گا بھٹی صاحب ----- آپ چائے منگوالیں" -----

میں نے خود کو نارمل کرنے کے لیے کہا۔

دوپہر کے بعد میرے لیے فون آگیا ----- دوسری طرف لائن پر الماس بائی موجود تھی۔

"حنیف باؤ ----- ہماری تو مجبوری ہے شریف گھرانوں میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے

لیکن تمہاری مہربانی آج شام کو تم ضرور آنا---- خان صاحب بھی تمہارا بہت پوچھ رہے ہیں۔"

اس نے دعا سلام کے فوراً بعد کہا۔

"اچھا---- یہ خان صاحب کو میری کچھ زیادہ ہی فکر نہیں رہنے لگی"-----

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔"

بس حنیف باؤ۔ جس سے خان صاحب کو محبت ہو جائے اس کا تمہاری طرح بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اچھا شام کو ملاقات کریں گے۔"-----

اس نے مجھ پر جوابی چوٹ کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔



شام کو میں حسب سابق پہلے رنگی خاں کی طرف چلا گیا جہاں اچھا خاصا ڈرامہ میرے لیے تیار کیا گیا تھا۔ نوری کی ماں نے میری شکل دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا---- دوسرے کمرے سے خان صاحب بھی باہر آکر میری بلائیں لینے لگے۔

ان کے لیے تو سونے کا انڈہ دینے والی مرغی دوبارہ ڈربے میں بند ہونے آگئی تھی۔

"بیٹا شکر ہے مولا کا---- تمہاری ساس کو تو جس دن سے اطلاع ملی ہے اس نے کھانا پینا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا---- یار آج اسے کچھ کھلا کر جانا ورنہ یہ مر جائے گی۔

رنگی خان نے کہا۔

"میں نے تو دیگ سکھی تھی۔ مولا کی نیاز دلاؤں گی---- شکر ہے مولا کریم کا میرا بچہ گھر آگیا یا مولی اس موذی کا خانہ خراب جس نے میرے بچے پر حملہ کروایا---- اس

بیڑہ غرق اس پر بھی بس قیامت گزرے تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو-----"

اس نے باقاعدہ ماتمی انداز اختیار کر لیا۔

"ماں جی---- کوئی بات نہیں شاید کسی کو غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ میرا کسی سے کیا لینا دینا۔

شکر ہے اللہ تعالیٰ کا میں بچ گیا-----

میں نے اسے مطمئن کرنے کو کہا۔

"مولا ان کا بیڑہ غرق کرے۔ خانہ خراب کو تمہارے متعلق ہی غلط فہمی ہونی تھی----" بیٹا میں تو کہتی ہوں میری کوئی لاٹری نکلے اور اس الماس بائی کا قرض اتار کر نوری کو تیرے حوالے کروں---- ہائے میری بچی نے کیا حال کر لیا ہے اپنا---- ساری ساری رات تمہارے لیے روتی رہی ہے"-----

زمانہ ساز میراثن نے باقاعدہ ٹسوے بہانے شروع کر دیے۔

میں نے سو روپے کا نوٹ دے کر بشیرے سے کچھ کھانے کے لیے اور چائے منگوائی پھر "زبردستی" اسے کھلایا۔

روانگی پر پانچ سو روپے میں نے "ماں جی کو دیگ کے لیے دے دیے جو انہوں نے میری صحت ہونے پر نیاز دینی تھی---- رنگی خان صاحب مجھے بار بار محتاط رہنے کی تلقین کر رہے تھے میں تھوڑی دیر بعد الماس بائی کے ڈیرے پر آگیا کیونکہ نوری یہاں نہیں تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ وہاں ہو گی-----

اور-----

مجھے اس سے باقاعدہ ملاقات کیے آج پندرہ بیس روز ہونے کو آرہے تھے۔

الماس بائی نے مجھے نوری کی عادت سی ڈال دی تھی اور لاشعوری طور پر میں نے جنسی جذبے کو ہی دنیا کا سب سے مضبوط جذبہ سمجھ لیا تھا۔

کوٹھے پر میرا استقبال خان صاحب اور الماس بائی نے کیا۔

خان صاحب نے مجھ سے تمام تفصیلات دوبارہ پوچھیں۔ میں نے جان بوجھ کر اس طرح کہانی سنائی کہ اس کو مجھ پر بالکل شک نہ ہو۔

"خان صاحب ---- مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی کو علم تھا کہ میں ۵۰ ہزار روپے لے کر جا رہا ہوں انہوں نے صرف روپے چھیننے کے لیے یہ کیا----"

میں نے جان بوجھ کر کنکھیوں سے الماس بائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو ہمارے لیے چائے تیار کر رہی تھی----

"یار حنیف باؤ---- پیسوں کی پرواہ نہ کر بادشاہ---- کام کر کام---- یہ لے یہ تیرا نقصان ہم پورا کریں گے---- لیکن کام ہونا چاہیئے---- کل ہی---- اس سے پہلے کہ یہ سالے گڑے مردے اکھاڑنے شروع کریں تم فائلوں کے اس قبرستان کو ہی آگ لگا دو----"

اتنا کہہ کر خان صاحب نے بیگ کھولا اور پھر مجھے ہزار ہزار کے پچاس نوٹ گن کر دے دیے---- "ایک مرتبہ پھر میرا ایمان ڈگمگا گیا۔

میں جانتا تھا یہ وہی روپے ہیں جو مجھے دے کر چھینے گئے تھے اور اب دوبارہ دیے جا رہے ہیں۔ لیکن---- اب مجھے اس کے اشاروں پر ناچنا تھا۔

بالکل اس بندر کی طرح جو مداری نے زنجیر کے ساتھ باندھ کر اپنے قابو میں کیا ہوتا ہے اور جو اس کے کہنے پر ہی نئے نئے کرتب دکھاتا ہے۔

"مطمئن رہنا حنیف باؤ---- میں حملہ آوروں کو زمین کے پاتال سے ڈھونڈ نکالوں گا اور ان کا وہ حشر ہو گا کہ ایک زمانہ دیکھے گا"----

ایم پی اے خان صاحب نے مجھ پر احسان جتلایا----

"خان صاحب کوئی بات نہیں آپ نے نقصان کا ازالہ تو کر دیا ہے"

میں نے بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے نوٹوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس مرتبہ میرا بندہ تمہیں گھر تک چھوڑ آئے گا"----

خان صاحب نے دوبارہ کہا۔

جانے سے پہلے مجھے مل لینا---- یہ رقم سنبھالو----"

اتنا کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق الماس بائی بھی ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جانے سے پہلے اس نے میری طرف دیکھ کر معمول کے مطابق بے شرمی سے آنکھ دبائی تھی---- "اپنی محبوبہ سے مل کر جانا ہائے بے چاری تمہارے لیے مری جا رہی تھی"----

اور----

جیسے ہی اس نے قدم باہر رکھا۔

نوری کمرے میں آ گئی----

ایک مرتبہ پھر اس نے مجھے محبت، جنس اور گناہ کے گہرے دلدل میں اتار دیا اور ہم نے معمول کا شیطانی کھیل شروع کر دیا۔

نوری میرے حواس پر اتنی غالب آ چکی تھی کہ میرے لیے اب اس کے وجود کے سوا تمام چیزیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسے الماس بائی نے خصوصی تیاری کے ساتھ میدان میں اتارا تھا۔

ان شیطانوں نے اگلے ہی روز مجھ سے جو وحشیانہ حرکت کروائی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میرے ہوش و حواس کو گم کر دیں۔

گھناؤنے کھیل کے خاتمے پر نوری نے ڈرامے کے دوسرے ایکٹ پر عمل شروع

کیا۔

"حنیف باؤ ---- اب ہمیں حق سچ کے رشتے میں بندھ جانا چاہیئے۔ میری تو جان بھی تمہارے لیے حاضر ہے لیکن روز روز یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ جب سے تم نے میری اماں کے ساتھ رشتے کی بات کی ہے۔ میں نے الماس بائی کی لڑکی پنکی کے ساتھ باہر جانا چھوڑ دیا ہے ---- اب میں کسی فنکشن پر بھی نہیں جاتی ---- گڈی سائیں کے پیر صاحب کا عرس آگیا وہاں میری قوالی لازماً ہو گی لیکن کہ میں نے اس مرتبہ اسے بھی انکار کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ باؤ حنیف جلد از جلد اس گشتی کا قرض اتارو اور مجھے اس کی قید سے رہا کروا کر لے جاؤ ----"

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈالیں اور ٹسوے بہانے شروع کر دیے۔

"نوری تم بے فکر ہو جاؤ ---- اب میں تمہیں زیادہ دیر اس قید میں نہیں رہنے دوں گا۔ یہ بات میری غیرت کے بھی منافی ہے"----

خدا جانے نوری نے میری اس بڑھک پر اپنی ہنسی کیسے روکی ہو گی۔

نوری کے دوسرے کمرے میں جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی جب میں باتھ روم سے باہر نکلا تو کمرے میں خان صاحب اور ان کا ایک ساتھی موجود تھا۔

"کل یہ نوجوان تمہیں ملنے آئے گا"----

خان صاحب نے لگی پٹی رکھے بغیر اپنی بات کا آغاز کیا۔

"تمہیں دو بجے چھٹی ہوتی ہے---- دو بجنے میں دس منٹ پر یہ تمہارے پاس آئے گا اور تمہیں ایک چھوٹا سا بیگ دے دے گا---- تم نے چونکہ ریکارڈ روم میں فائلیں وغیرہ رکھنی ہوتی ہیں وہ آخری لمحات میں رکھنے جانا---- خیال رکھنا یہ کام بڑے حساب کتاب سے ہونا چاہیئے۔ کسی کو یہ علم نہ ہو کہ ریکارڈ روم میں جانے والے آخری شخص تم تھے"----

خان صاحب نے بڑی رازداری سے میری طرف قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

"آپ نے صرف ایک چھوٹی سی زحمت کرنی ہے باؤ جی"-----

خان صاحب کے ہمراہی نے کہا۔

"کیا"-----

میں نے خوف کے مارے تھوک نگل کر کہا۔

"یہ دیکھ رہے ہیں ---- یہ ایک گھڑی ہے -----"

اس نے مجھے ایک چھوٹا سا ٹائم پیس دکھایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ آپ نے ریکارڈ روم میں بیگ رکھتے ہوئے۔ اس گھڑی کے سر پر موجود اس سرخ رنگ کے بٹن کو دبانا ہے اور اطمینان سے باہر جانا ہے ----- اس بٹن کو دبانے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد دھماکہ ہو گا اور بیگ میں رکھا مادہ آگ پکڑ لے گا---- آپ بھی کیا اس وقت آپ کی برانچ کا کوئی شخص بھی کمرے میں نہیں ہو گا---- کرتے رہیں سالے بعد میں انکوائریاں -----

اس نے شیطانی قہقہہ بلند کیا۔

"اور کیا----"

خان صاحب نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

جب دونوں شیطان ہنس رہے تھے۔ خوف سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

"یار تم تو اس طرح گھبرا رہے ہو جیسے کسی کی جان لینے جا رہے ہو-----"

خان کے ساتھی نے شاید میری زخمی کیفیت پر طنز کیا تھا۔

"نہیں ---- اس میں بھلا گھبرانے کی کیا بات ہے۔"-----

میں نے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہا۔

"شیر بن شیر"-----

خان نے دیوانہ وار ہنستے ہوئے کہا۔

اور-----

میں گدھے سے شیر بن گیا-----

میں نے بھی بے وقوفوں کی طرح دانت نکالنے شروع کر دیے۔

ممکن ہے میں یہ گھناؤنی حرکت کرنے کی ہمت نہ کرتا----- لیکن ----- خان صاحب کی طرف سے ۵۰ ہزار کی نئی قسط نے میرا ایمان ڈگمگا دیا۔

میں نے سوچا اب نوری کو حاصل کرنے کے لیے بمشکل ایک آدھ ماہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے گمراہ دماغ نے مجھے اطمینان دلایا یہ لوگ ایسا کفر کا طریقہ استعمال کر رہے ہیں جس کے بعد مجھ پر شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"باؤ حنیف۔ مطمئن رہنا۔ ہم دو چار روز بعد تمہارا یہاں سے تبادلہ ہی کسی اور دفتر میں کروا دیں گے ----- کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی"-----

خان صاحب نے اٹھتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"شکریہ خان صاحب"-----

میں نے بڑی بے حیائی سے کہا۔

اس نے اپنی دانست میں مجھے ایک اور نفسیاتی ڈوز دے دی تھی اب میرے پاس ایک اور ذہنی تحفظ موجود تھا۔

ایک مرتبہ پھر میں نے نوٹ جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے اور اپنی راہ لی ----- اس مرتبہ خان صاحب کا ایک بندہ جو شکل ہی سے خونخوار درندہ دکھائی دے رہا تھا مجھے گھر تک چھوڑنے جا رہا تھا۔

پہلی مرتبہ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہی وہ شخص ہے

جس نے کچھ روز پہلے مجھ پر یہاں حملہ کیا تھا۔ میں نے اسے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی رخصت کر دیا۔

O O

والد صاحب چلے سے گھر واپس لوٹ آئے تھے۔

انہیں والدہ نے تو نہیں البتہ دینو پہلوان نے مرچ مصالحہ لگا کر ساری کہانی سنائی تھی اور اب وہ بڑے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں رات دیر گئے تک انہیں اس بات کا یقین دلاتا رہا کہ حملہ آوروں نے کسی اور کے دھوکے میں مجھ پر حملہ کر دیا ہے۔ شاید اندھیرے کی وجہ سے انہیں شناخت میں دھوکہ ہوا ہو-----

والد صاحب بے چارے شریف اور سیدھے سادے آدمی تھے انہوں نے میری بات پر یقین کر لیا اور سجدہ شکر بجا لائے کہ کسی اور کے دھوکے میں ان کے صاحبزادے کو اتنا ہی نقصان پہنچا جان نہیں چلی گئی-----

ساری رات میں ڈھنگ سے نہیں سو سکا۔

ساری رات کروٹوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔

کبھی پکڑے جانے کا خوف ایک جن کی صورت میں خوشیاں نکالتا دکھائی دیتا اور دوسرے ہی لمحے نوری مہربان پری کی طرح میری مدد کو آجاتی-----

تین چار دن دل و جان سے میری خدمت کرنے والی عابدہ کو تو میں نے یکسر فراموش کر دیا تھا۔

نوری کا رنگ بڑا گہرا چڑھ گیا تھا مجھ پر-----

اس کے سامنے کوئی اور روپ ٹھہرتا ہی نہیں تھا----- آنکھوں کو بھاتا ہی نہیں تھا۔ ساون کا اندھا جو بن گیا تھا میں-----

صبح دفتر جاتے ہوئے بلاشبہ خوف سے میرے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ میں نے

موٹر سائیکل گھر پر ہی چھوڑ دی کہ کہیں راستے میں ایکسیڈنٹ ہی نہ ہو جائے۔

دفتر میں رکشہ میں بیٹھ کر پہنچا اور چپ چاپ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ یہاں میری زیادہ ملاقات اپنے پرانے ساتھی بھٹی صاحب سے تھی۔ جنھوں نے ایک دو مرتبہ میرا حال دریافت کیا۔ میں نے ناسازی طبع کا بہانہ کیا۔

بھٹی صاحب نے اپنی نیک طبع کے مطابق دوران علاج کھائی جانے والی دواؤں کے اثرات بد سے خبردار کیا اور مجھے نصیحت کی کہ میں دودھ وغیرہ خوب پیا کروں اس طرح اینٹی بائیوٹک دواؤں کے اثرات ختم ہوں گے۔

میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملادی -----

اور -----

سر جھکا کر اپنی بدبختی کا ماتم کرنے لگا۔

مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ جو میں کبھی اتنی ہمت آئے گی کہ میں دفتر کے ریکارڈ روم میں آگ لگانے والا دھماکہ خیز مواد نصب کروں گا -----

لیکن ----- ہونی ہو کر رہی۔ شاید یہ بدبختی بھی میرے منہ کی سیاہی بنتی تھی۔

بھٹی صاحب نے دو مرتبہ کنٹین سے دودھ پتی منگوا کر مجھے پلائی اور میں نے دکھاوے کے لیے ایک دو گولیاں بھی نگلیں۔ تاکہ کسی کو مجھ پر خواہ مخواہ شک نہ ہو -----

"دو چار دن کی اور چھٹی لے لو یار ----- آرام کرو ----- ابھی تم مکمل صحت یاب نہیں ہوئے" -----

بے چارے بھٹی صاحب جنھوں نے میرے والد کے ساتھ اپنی نوکری کے کچھ سال گزارے تھے میری ہمدردی میں مرے جا رہے تھے۔

مجھے ان کا یہ خیال بڑا پسند آیا۔

آپ کہتے تو ٹھیک ہیں بھٹی صاحب میں آج درخواست دے جاؤں گا۔ ابھی تک

میرے سر کا درد نہیں گیا ----- شاید آرام کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہے"۔

میں نے کہا۔

میں نے سوچا اس طرح مجھے کم از کم اس ہونے والے حادثے کے دو چار دن بعد تک دفتر نہ آنے کا قانونی جواز مل جائے گا اور میں سب کی نظروں سے بچا رہوں گا۔ ممکن ہے اس طرح میں نارمل ہو جاؤں۔

ایک مرتبہ پھر میں دکھاوے کے لیے اپنا سر میز پر رکھ کر بیٹھا رہا۔

ٹھیک پونے دو بجے خان صاحب کا آدمی مجھے ملنے آگیا۔ ہمارے دفتر کے جس شعبے میں مجھے رکھا گیا تھا۔ یہاں عام لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر آہٹ کو اپنے پاؤں سے نزدیک کرنے کے بعد اونچی آواز میں اس سے معذرت کرلی۔ جیسے ہم یہاں معمول کے سائلوں سے کیا کرتے تھے۔

"سر جی ----- میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ کی مہربانی میں کل آپ کو ڈیل کروں گا" -----

میں نے معذرت کی۔

وہ بھی پکا کھلاڑی تھا۔

"واہ جی واہ ----- عجیب مذاق ہے عجیب دفتر ہے یہ۔ دھاندلی مچا رکھی ہے تم لوگوں نے معمولی سا کام ہے اور یہ میرا پانچواں چکر ہے۔ ابھی سو دو سو روپے لگا دوں تو سب کچھ ہو جائے گا پر میں نے بھی قسم کھائی ہے کہ رشوت نہیں دوں گا۔ جہنم میں جائے میری فائل" -----

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا چلا گیا۔

"پاگل لگتا ہے سالا -----"

میرے ساتھ والے نے کمنٹ کیا۔

"اور کیا ---- دوسروں کا احساس ہی نہیں رہا ان لوگوں میں" ----

بھٹی صاحب نے میری وکالت کی۔

○○

چھٹی کا وقت ہو رہا تھا۔

ایک ایک کر کے اپنی جگہ سے کھسک رہے تھے۔ قریباً پانچ منٹ بعد میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے دو چار فائلیں جو نیچے رکھی تھیں اٹھائیں۔ ساتھ میں وہ چھوٹا سا بیگ لیا اور ریکارڈ روم کی طرف چل دیا۔

اپنی دانست میں تو میں نے بطور خاص یہ احتیاط کی تھی کہ کوئی مجھے جاتے ہوئے نہ دیکھے اور ریکارڈ روم میں پہنچ گیا۔

لرزتی ٹانگوں اور کپکپاتے ہاتھوں سے میں نے بڑی ہمت کر کے بیگ کی زنجیر کھولی ---- اندر بالکل ویسی ہی ایک گھڑی رکھی تھی جیسی اس موذی نے مجھے الماس بائی کے گھر دکھائی تھی۔ اس گھڑی سے کچھ نیلے پیلے تار لپٹے ہوئے تھے جن کے نیچے ایک گتے کا ڈبا نصب تھا۔

میں نے جیسے ہی گھڑی کے اوپر لگے سرخ بٹن کو دبایا۔ بیگ میرے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا کیونکہ گھڑی نے ٹک ٹک کرنا شروع کر دیا تھا۔

خدا کی پناہ ----

یہ ٹائم بم تھا۔

اسی بیگ میں آگ پکڑنے پکڑنے والا مادہ رکھ کر ٹائم بم نصب کیا گیا تھا کہ جیسے ہی بم پھٹے یہ آتش گیر مادہ آگ پکڑے اور یہاں موجود سب کچھ جل کر خاک ہو جائے کیونکہ یہاں چاروں طرف فائلوں اور کاغذات کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لکڑی کی پچاس پچاس سال پرانی الماریاں نصب تھیں جنہیں جلانے کے لیے صرف ایک تیلی ہی

کافی ہو گی۔

اس وقت میری حالت اس تخریب کار جیسی تھی جو دشمن ملک کی انٹیلی جنس ایجنسی کا آلہ کار بن کر پہلی مرتبہ اپنے ملک کے کسی حساس مقام پر بم نصب کرنے جا رہا ہو ----

میں قریباً بھاگتا اور لڑکھڑاتا ہوا ریکارڈ روم سے باہر آیا ----

راہداری ویران پڑی تھی۔

میں نے جان بوجھ کر وہ راستہ اختیار کیا جس طرف کسی کے دکھائی دینے کا امکان ہی نہ ہو۔ بلاشبہ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور دفتر سے باہر آنے تک کسی شناسا چہرے پر میری نظر نہیں پڑی۔

سڑک پر میں رکشہ کے انتظار میں کھڑا تھا جب مجھے اچانک ہی پراچہ کی شکل دکھائی دی۔ جو سیدھا میری طرف آ رہا تھا۔ پراچہ کا آنا جانا چونکہ یہاں لگا رہتا تھا اس لیے ہماری ملاقاتیں بھی عموماً اس طرح ہوا کرتی تھیں ----

میں نے بے چینی سے گھڑی کی سوئیوں پر نظر ڈالی ابھی دھماکہ ہونے میں چھ سات منٹ باقی تھے۔ "خیریت ----"

اس نے میرے نزدیک پہنچ کر کہا۔

"یار آج طبیعت بہت خراب تھی۔ دراصل ڈاکٹر نے پندرہ بیس روز آرام کرنے کو کہا تھا اور مجھے دفتر آنا پڑا۔ آج چار روز کی چھٹی کی درخواست دے آیا ہوں۔ موٹر سائیکل بھی اس لیے نہیں لایا کہ شاید صحیح طرح چلا نا پاؤں ---- چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔"

میں نے اسے کہا۔

میرے لیے اب یہاں ایک پل رکنا بھی ممکن نہیں رہا تھا اور میں جلد از جلد یہاں

سے دور ہٹ جانا چاہتا تھا۔

"چلو ----- بیٹھو"-----

پراچہ نے مجھے پہلے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی۔ ہم دونوں اس کے مخصوص ریسٹورنٹ تک پہنچ گئے۔

پراچہ نے معمول کے مطابق چائے اور دیگر لوازمات منگوائے اور ہم باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے خود پر بڑا جبر کر کے اپنے آپ کو نارمل کیا ہوا تھا۔

"اس روز میں نے جیدے کا نام لیا تھا حنیف باؤ ----- اور تم نے میری بات نہیں مانی تھی میری ایک بات یاد رکھنا ----- جیدا خان صاحب کی بڑی کمزوری ہے۔ اندرون شہر کا ان کا پاؤڈر والا سارا دھندا جیدا چلا رہا ہے۔ اس کے ذریعے خان صاحب کو لاکھوں روپے ماہانہ آمدن ہے اور وہ ایسے شخص کو ناراض نہیں کر سکتا ----- وہ تو حنیف باؤ تمہاری قسمت اچھی تھی جو اس نے جیدے کو قابو کر لیا ورنہ -----"

ابھی اس کی بات نامکمل ہی تھی جب کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے اسے مخاطب کیا۔

"پراچہ صاحب! آپ کا فون آیا ہے-----

"ابھی آیا یار ----- یہ دفتر والے قبر میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے-----"

وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور اپنا فون سننے چلا گیا۔

فون سنتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے دکھائی دے رہے تھے اور وہ بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔

فون رکھ کر وہ بڑی تیزی سے میری طرف آیا۔

"یار بڑا غضب ہو گیا"-----

اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"کیا؟"

حالانکہ مجھے علم تھا وہ کیا جواب دے گا۔

"تمہارے دفتر کے ریکارڈ روم میں آگ لگ گئی ہے۔ دفتر والوں کا فون تھا میں ادھر ہی جا رہا ہوں-----"

اس نے اپنی ٹوپی ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہو ----- یہ کیسے ہوا؟"

میں نے اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ یار ----- ہو جاتا ہے ----- کسی سالے نے اندر جلتا ہوا سگریٹ چھوڑ دیا ہو گا یا پھر بجلی کے ننگے تاروں کی مہربانی ہو گی اور کیا ----- تم چلو گے میرے ساتھ -----"

اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں یار پراچہ میری تو طبیعت بہت خراب ہے۔ مجھے تو گھر ہی جانے دو-----"

میں نے بہانہ کیا۔

"میں چھوڑ آؤں"-----

پراچہ نے خلوص دکھایا۔

"نہیں چلا جاؤں گا۔ بھائی تمہاری بھی نوکری کا معاملہ ہے۔ میں تین چار دن گھر پر ہی ہوں۔ آ جانا"----- میں نے کہا۔

ہم دونوں باتیں کرتے باہر آ گئے-----

پراچہ نے ایک رکشہ کو ہاتھ دیا اور میرے "ناں ناں" کرنے کے باوجود اسے زبردستی کرایہ دے کر مجھے گھر روانہ کر دیا۔

پراچہ سے میں نے دو کام مفت لئے تھے ----- اگر عام آدمی کے سپرد ہوتا تو ہزار پانچ سو سے زیادہ کیا مل جاتا۔

لیکن ----- میں نے اس سے تعلقات قائم رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ جس کے

بعد سے وہ میری کچھ عزت بھی کرنے لگا تھا۔

رکشہ نے مجھے اپنے محلے تک کیسے پہنچایا؟

یہاں سے اپنے قدموں پر چل کر میں اپنے گھر تک کیسے پہنچا؟

دینو پہلوان کی خطرناک نظروں سے بچ کر میں نے سترہ سیڑھیاں کس طرح عبور کیں؟

خدا ہی بہتر جانتا ہے وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا۔

گھر پہنچ کر میں چارپائی پر لیٹ گیا اور رات تک اسی طرح بے سدھ لیٹا رہا----
میں نے گھر والوں کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔

ان کے استفسار پر ناسازی طبع کا بہانہ تراشا اور دکھاوے کے لیے دو تین ملٹی وٹامنز کی گولیاں بھی پھانک لیں۔

اس رات مجھے سونے کے لیے زندگی میں پہلی مرتبہ خواب آور گولیوں کا سہارا لینا پڑا۔ ساری رات خواب میں پولیس مجھے ڈراتی رہی----

یہ ڈراؤنے خواب دیکھنے سے میرا جاگنا زیادہ بہتر ہوتا۔



صبح میں نے بے چینی سے اخبار کا مطالعہ شروع کیا۔

اخبار کے پہلے صفحے پر ہی ریکارڈ روم میں آگ لگنے کی خبر بڑی نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

پراچہ کے خیال کے عین مطابق پولیس کی طرف---- متضاد بیانات دیے گئے تھے جن میں آگ لگنے کی وجہ جلتا ہوا سگریٹ، بجلی کے ننگے تار اور ناقص وائرنگ ہی سمجھی جا رہی تھی---- لیکن ایک ذیلی سرخی کے ساتھ ایک چشم دید گواہ کا یہ بیان بھی تھا کہ اس نے آگ لگنے سے پہلے دھماکے کی آواز سنی تھی----

اور -----

اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے پولیس کے ایک اعلیٰ آفیسر نے اس پر "تخریب کاری" کا شک کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ پولیس ان لائنوں پر بھی تحقیقات کر رہی ہے۔

اخبار والے بڑی دور کی کوڑی لائے تھے اور انہوں نے لکھا تھا کہ اس دفتر میں کھلی دھاندلی اور بے قاعدگیاں معمول کی بات ہے۔ گزشتہ دنوں یہاں سے ایک اہم فائل بھی چوری ہو گئی تھی---- مگر اب ریکارڈ روم کو آگ لگ گئی ہے۔

آگ اتنی تیزی سے پھیل گئی کہ فائر بریگیڈ کے وہاں پہنچنے تک ایک فائل بھی سلامت نہیں رہی تھی۔

ان حالات میں اخبار والوں کی نپی تلی رائے یہی تھی کہ یہ تخریب کاری ہے اور سرکاری اہلکاروں نے مک مکا کرنے کے بعد اپنی دھاندلیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے واردات کروائی ہے تاکہ ماضی میں ہونے والی بھیانک کرپشن کا بھید عوام تک نہ پہنچ جائے۔ میں جانتا تھا اپنے ملک کی پولیس کو----

اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو اسے اتفاقی حادثہ قرار دے کر فائل بند کروا دی جاتی ---- لیکن ---- برا ہو ان اخبار والوں کا جو بال کی کھال اتارتے ہیں اور جنہوں نے اس مسئلے کو بھی اتنا اچھال دیا تھا کہ اب پولیس کو مجبوراً دوسری لائن پر بھی سوچنا تھا میں چونکہ اگلے تین چار روز چھٹی کی درخواست دے آیا تھا---- اس لیے گھر پر ہی رہا۔

لیکن ---- قریباً دس گیارہ بجے میرے دفتر سے ایک چپراسی آیا جس نے بتایا کہ مجھے بھی فوراً دفتر بلایا گیا تھا۔

"لیکن میں تو بیمار ہوں----"

میں نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سر جی ---- پولیس والے آئے ہیں اور انہوں نے سب کو بلایا ہے۔ مجھے تو

افضل صاحب نے کہا تھا کہ آپ کو پیغام پہنچا دوں -----"

وہ بے چارہ خود بڑا گھبرایا ہوا اور قدرے حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا۔

"اچھا تم چلو----- میں آتا ہوں -----"

میں نے اسے کہا اور نیچے بازار میں آ گیا۔

بازار میں موجود پی سی او سے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ الماس بائی کو فون کر کے خان صاحب سے براہ راست بات کرنے کے لیے ان کا فون نمبر مانگا تو اس نے مجھے وہیں ایک دو منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا۔

قریباً تین چار منٹ بعد میں نے دوبارہ فون کیا تو اس نے فوراً ہی کہا۔

"خان صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا ہے تم بے دھڑک اپنے دفتر جاؤ۔ تم سے کوئی کچھ نہیں کہے گا----- پچھلی بار کی طرح اس مرتبہ بھی تم انکوائری میں نہیں آؤ گے"-----

"ٹھیک ہے پھر بھی انہیں کہنا خیال رکھیں"-----

میں نے کہتے ہوئے فون بند کیا اور گھر آ گیا۔

میں نے والد صاحب کو بتایا کہ ہمارے دفتر کے ریکارڈ روم میں آگ لگ گئی ہے اور پولیس والوں نے سب کو انکوائری کے لیے بلایا ہے۔

"بیٹا اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو معمول کی بات ہے۔ اگر دفتر میں کچھ ہو گا تو پولیس انکوائری تو کرے گی -----"

والد صاحب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔ سر چکرا رہا ہے آپ میرے ساتھ چلیں"-----

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق میں نے کہا۔

"ہاں ہاں ----- کیوں نہیں ----- آؤ وہیں سے تمہیں ڈاکٹر کو دکھا دوں گا"-----

یہ کہہ کر والد صاحب میرے ساتھ ہی نیچے آ گئے۔

خوف اور گھبراہٹ سے میری گھگھی بندھی ہوئی تھی ----- بظاہر اپنے خوف اور ل کے چور کو میں نے ناسازگی طبع کا نام دے لیا تھا۔

لیکن ----- مجھ سے زیادہ حقیقت حال سے کون آگاہ تھا؟

میرے لیے اپنے آپ پر قابو رکھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ اپنے والد کے ساتھ میں رکشہ یں دفتر پہنچا تو وہاں پولیس کے درجنوں باوردی اہلکار گھوم رہے تھے۔

والد صاحب مجھے سہارا دے کر اپنے کمرے تک لائے۔

اس دوران وہ جہاں سے بھی گزرے ان سے پرانے ساتھی بڑے احترام سے انہیں سلام کرتے جا رہے تھے۔ اچانک ہی میرے متعلقہ افسر سامنے آ گئے۔

والد صاحب کو دیکھ کر انہوں نے اس طرح احترام سے نظریں جھکا لیں جیسے والد صاحب ہی ان کے افسر رہے ہوں۔

"مولوی صاحب خیریت ----- آپ ادھر ----- آپ نے کیوں زحمت کی؟"

انہوں نے احتراماً" پوچھا۔

"حنیف کل سے بیمار ہے ----- آپ کو تو علم ہے اس کے سر میں چوٹ لگی تھی۔ اکٹر نے پندرہ بیس روز آرام کے لیے کہا تھا لیکن جوانی دیوانی ----- اب پریشانی لگی ہے -----"

انہوں نے کہا۔

"اوہو ----- اسے لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

انہوں نے ہمدردی سے میرے سراپے پر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

سر! میں نے چھٹی کی درخواست دے دی تھی کل بھی میں جلدی چلا گیا تھا۔ ان ا صبح صبح اقبال نے آپ کا پیغام دیا تھا کہ انکوائری کے لیے دفتر ضرور آنا ہے -----

پولیس نے طلب کیا ہے"-----

والد صاحب کی بجائے میں نے جواب دیا۔

"یار! تم مولوی صاحب کے بیٹے ہو۔ مجھے تو علم ہی آج ہوا ہے۔ جاؤ بیٹا آرام کرو۔ کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا----- اور اب صحت یاب ہو کر آنا-----

"انہوں نے کہا"۔

"شکریہ وحید صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی اور اقبال مندی سے نوازے"-----

والد صاحب نے اپنی دعائیں دیں۔

آج مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے کھوکھلے فلسفے اور خود ساختہ سچائیوں کے جھوٹے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا والد صاحب کی ایمانداری نے مجھے بچالیا تھا----- انکی شکل پر نظر پڑتے ہی یہاں موجود ان کے پرانے جاننے والوں کی آنکھوں میں ان کے لیے احترم دکھائی دینے لگتا تھا-----

کاش میں نے اپنے والد کی باتوں کو سچ مان کر ان کو اپنا لیا ہوتا؟

مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا-----

لیکن ----- یہ پچھتاوا چڑیوں کے کھیت چگ جانے کے بعد واحد پچھتاوا تھا۔ جو بے سود اور بے وقت کی راگنی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

والد صاحب کے ساتھ گھر واپس آنے پر مجھے یوں لگا جیسے میرے سر سے منوں بوجھ اتر گیا ہو----- ایک پچھتاوا تو مستقل میرے اعصاب پر سوار تھا۔

لیکن ----- مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک مرتبہ پھر پولیس کی گرفت سے بچ گیا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہا ہوں اور ایک مرتبہ پھر جیل کی سلاخوں اور میرے درمیان کوئی نادیدہ قوت حائل ہو گئی ہے۔

سارا دن میں نے اپنے گھر پر بیماروں کی طرح گزارا-----

رات کو پھر خواب آور گولیاں پھانکیں اور سو گیا-----

صبح اٹھ تو جسم کا رواں رواں دکھ رہا تھا-----

میری آنکھ کھلی تو میری ماں قرآنی آیات پڑھ کر مجھ پر پھونک رہی تھی اور عابدہ میرے نزدیک ہی پیڑی بچھائے بیٹھی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب"؟

اس نے مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر دریافت کیا۔

"بالکل ٹھیک ہوں----- عابدہ تمہارا شکریہ۔ تم اتنی تکلیف نہ کیا کرو-----"

میں نے جذبات سے عاری لہجے میں اسے جواب دیا۔

عابدہ کے چہرے پر اداسی اتر آئی۔

شاید اسے مجھ سے ایسی بے رخی کی توقع نہیں تھی۔

لیکن ----- شاید اس بے وقوف کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ نوری کی جنسیت کا کالا جادو مجھ پر چل چکا تھا۔ اس کے سامنے کوئی بھی ٹونہ ٹوٹکا کارگر نہیں تھا-----

اس نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خدمت کے ذریعے مجھے فتح کرنے کی راہ اپنائی تھی-----

لیکن ----- بے چاری دینو پہلوان کی بیٹی میں اپنے ماں باپ والی ہوشیاری چالاکی تو دور دور تک بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اگر اس پر اپنی ماں کی تربیت کا کچھ بھی اثر ہوتا تو وہ میرے سر سے نوری کا بھوت اتارنے کے لیے کسی بڑے جادوگر کی خدمات حاصل کرتی----- میری رگوں میں نوری کی جنسیت کے پھیلائے ہوئے زہر کا تریاق کسی زیادہ تیز اثر والے زہر سے کرتی-----

اپنی ماں کی طرح کوئی ایسا داؤ پیچ نکالنے میں چاروں شانے چت ہو کر اس کے قدموں میں آن پڑتا---- لیکن ---- وہ تو اللہ میاں کی گائے تھی ----

پہلے وہ مجھے نورجہاں اور لتا منگیشکر کے گانوں سے فتح کرتی رہی۔

پھر گدی سائیں کے ٹونے ٹوٹکے آزمائے۔

اور اب ----

خدمت کے ہتھیار کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئی تھی۔

بے چاری عابدہ ----



چار دن تک اخبارات کی خبروں نے خوفزدہ کئے رکھا۔

بالآخر اس خبر کے بعد کہ حکومت نے اس حادثے کی وجوہات جاننے کے لیے ایک "تحقیقاتی کمیشن" قائم کر دیا ہے جو "بہت جلد اپنی رپورٹ" حکومت کو پیش کر دے گا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا----

ملک کا ایک باشعور شہری ہونے کے ناطے مجھے اس حقیقت سے مکمل آگاہی حاصل تھی کہ جس جگہ "تحقیقاتی کمیشن" بنا دیا جائے وہاں "ستے خیراں" ہیں۔

آج تک ایسے کسی کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی تھی۔

سرکاری فائلوں کا پیٹ بھرنے کے لیے البتہ بہت کچھ کیا جاتا تھا۔

چار دن کے بعد میں نے ایک ہفتے کی مزید چھٹی کا جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ تیار کروایا اور پراچہ کے ہاتھ دفتر بھیج دیا۔

پراچہ نے اس درمیان میری مکمل خبر رکھی تھی۔

ابھی تک اس کا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا کہ یہ آگ خان صاحب نے مجھ

بدبخت کے ذریعے لگوائی ہے۔ البتہ ایک باخبر کرائم رپورٹر ہونے کے ناطے وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ ماضی قریب میں ہونے والے زمینوں کے بڑے بڑے گھپلوں کی تحقیقات کا آغاز ہو رہا تھا اور مرکز سے بطور خاص ایک بڑا ایماندار افسر یہاں آ رہا تھا جس کے ہاتھوں کسی بھی کرپٹ بیڑے کا بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔

پراچہ کی زبانی مجھے علم ہوا کہ جیدے کو خان صاحب کبھی ناراض نہیں کر سکتے کیونکہ اندرون شہر ان کا سارا بزنس جیدا ہی چلا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس روز باغ میں ہونے والے حادثے پر خان صاحب نے اسے روک دیا اس امر پر دلالت کرتا تھا کہ خان صاحب کے نزدیک فی الوقت میری کتنی اہمیت ہے؟ اور انہیں میری کتنی ضرورت ہے۔

"ایک بات یاد رکھنا---- یوں تو میری حیثیت اس کے ایک کارندے کی سی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں اپنی محنت کا معاوضہ ٹھوک بجا کر لیتا ہوں ---- لیکن میں بھی ذہنی طور پر ہر وقت اس بات کے لیے تیار رہتا ہوں کہ خان صاحب کسی بھی وقت مجھ سے منہ موڑ لے گا ---- یا پھر اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد ٹشو پیپر کی طرح مجھے استعمال کر کے پھینک دے گا ---- حنیف باؤ تم بھی اس امکان کو نظرانداز نہ کرنا ---- یار میری طرح غریب آدمی ہو ان سے جو لاکھ دو لاکھ کمانے ہیں کما کر خاموشی سے جان چھڑا لو ---- تم ایک بڑی غلطی کر بیٹھے ہو جو جذباتی ہو کر تم نے الماس بائی کو بھی دھمکی دے دی تھی ---- وہ بڑی پختہ پرور عورت ہے اس بات کا بدلہ ضرور لے گی ---- حنیف باؤ خان صاحب کو ایک بڑی علت لگی ہوئی ہے جس کو صرف الماس بائی پورا کرتی ہے ---- یہی وجہ ہے کہ وہ خان بہادر کی مستقل کمزوری بن چکی ہے ---- بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ---- ویسے تمہیں میری بات بری تو بہت لگے گی لیکن میں نے تمہارے گھر کا نمک کھایا ہے اس لیے کیسے بہتر یہی رہے ---- حنیف باؤ تم

اپنے دل پر جبر کر کے نوری کے چنگل سے نکل جاؤ ---- اوئے یار! یہ نری کوئلوں کی دلدل ہے۔ اس میں سوائے اپنا منہ کالا کروانے کچھ حاصل نہیں ہو گا ---- کچھ نہیں۔"

وہ بڑا سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

پراچہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا ----

لیکن ---- حیرت انگیز طور پر میرے والد صاحب سے ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی وہ ان سے بہت متاثر ہو چکا تھا۔

مجھ ایسا کون بدبخت تھا کہ جو مولوی شریف احمد کا بیٹا ہو کر اس سے فیض حاصل نہ کر سکا اور ادھر سارا زمانہ میرے والد کی شرافت کا معترف تھا۔

"پراچہ میں بہت بری طرح پھنس گیا ہوں یار ---- بہت بری طرح۔ کسی طرح میں نوری کی ماں کو ایک لاکھ روپیہ پورا کر دوں پھر اسے لے کر یہاں سے نکل ہی جاؤں گا ---- میرے کہنے پر والدین یہ مکان بھی فروخت کر دیں گے ---- یار ہم کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے لیکن میں اسے نہیں چھوڑ سکتا ---- تم کسی ہیروئن پینے والے سے یہ توقع کر سکتے ہو کہ وہ اپنی قوت ارادہ کے بل پر اس نشے سے جان چھڑا لے ---- لیکن میں نہیں ---- مجھے نوری کے بدن کا نشہ ہے یار میں مر جاؤں گا۔"

میری آواز بھرا گئی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو جاری ہو گئے۔

پراچہ بھی اداس ہو گیا۔ شاید دل ہی دل میں مجھ پر لعنت بھی بھیج رہا ہو گا کہ ایک فاحشہ اور تیسرے درجے کی عورت کے لیے میں نے اپنی نسبی شرافت کو داؤ پر لگا دیا ہے۔



اگلے روز میں نے گھر میں رکھے پچاس ہزار روپے اٹھائے اور احاطہ بیلی رام پہنچ گیا ----

پچاس ہزار روپے شاید ان لوگوں نے میری طرح زندگی میں کبھی اکٹھے دیکھے ہی نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے نوری کی ماں کے ہوش ہی گم ہو گئے ہوں ----

وہ ندیدے بچوں کی طرح نوٹوں پر جھپٹی اور پلک جھپکنے میں اس نے خدا جانے دوسرے سٹور نما کمرے میں کسی جگہ نوٹ چھپا دیے۔ مجھ پر وہ اس طرح صدقے واری جا رہی تھی جیسے میں لال قلعہ فتح کرنے کے بعد واپس لوٹا تھا۔

نوری آج گھر پر ہی تھی ----

مجھے انہوں نے زبردستی شام تک بٹھائے رکھا اور نوری نے بطور خاص میرے لیے کھانا تیار کیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے مجھے اپنے پلے سے کھانا کھلایا تھا۔

شام ڈھلنے پر میں گھر لوٹ آیا۔ اب میں اس بات کی خاصی احتیاط کرتا تھا۔ کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ میں کسی نہ کسی ایجنسی کی مشتبہ لسٹ میں ضرور آ گیا ہوں اور وہ لوگ میری حرکات و سکنات پر نظر رکھ رہے ہوں گے ----

اب مجھے پچاس ہزار روپے اور جمع کرنے تھے۔

لیکن ---- چھٹی ختم ہونے سے ایک روز پہلے جب میں دفتر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا تو بھٹی صاحب میری خیریت دریافت کرنے گھر آئے۔ ان کے پاس ایک سرکاری حکم نامہ بھی تھا ----

"تمہارا تبادلہ دوسرے آفس میں ہو گیا ہے ---- یار شکر کرو ---- ہمارا دفتر ہوتا تو اب سی آئی ڈی والوں کا آفس بن چکا ہے۔ یہ افسر کسی نہ کسی کو انکوائری کے بہانے وہ لوگ لے جاتے ہیں اور شام تک اس بے چارے کو ذہنی مریض بنا کر واپس بھیجتے ہیں" ----

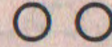
بھٹی صاحب نے مجھے سرکاری حکم نامہ دیتے ہوئے کہا۔

اور -----

میں نے واقعی خدا کا شکر ادا کیا-----

اس طرح کم از کم مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اب ماضی کی خطرناک وارداتوں کا خوف جو ہر وقت میرے ذہن پر سوار رہنے لگا تھا اس خوف سے تو کسی حد تک نجات مل جائے گی اور میں شاید خان صاحب کے "دست شفقت" سے بھی جان چھڑانے میں کامیاب ہو جاؤں ----- بھٹی صاحب تھوڑی دیر بعد چلے گئے -----

میں اگلے روز سرکاری حکم نامے سمیت نئے دفتر پہنچ گیا۔



اس دفتر میں میرا استقبال پیروں کی طرح کیا گیا۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک کلرک کو اتنے خلوص کے ساتھ خوش آمدید کہنے میں کیا مصلحت تھی۔ پہلے تو مجھے لگا جیسے ان لوگوں نے غلط فہمی سے مجھے کوئی افسر سمجھ اعلیٰ لیا ہے۔

لیکن ----- اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد احساس ہوا کہ واقعی وہ لوگ میرے شاہانہ استقبال کے لیے مجبور تھے اور اس کی وجہ اور کچھ نہیں بلکہ میری اہم ترین پوسٹ تھی -----

میرے علم میں یہ بات آئی کہ اس پوسٹ کو حاصل کرنے کے لیے لوگ سر دھڑ کی بازی لگا دیا کرتے ہیں اور اپنا تبادلہ اپنی اس پوسٹ پر کروانے کے لیے لاکھوں روپے کی رشوت دینے کے لیے تیار رہتے ہیں -----

دفتر کے لوگ باری باری میرے پاس آکر اپنا تعارف کروا رہے تھے۔ ان میں میرے سینیئر افسران بھی شامل تھے اور یہ میرے لیے پریشان کن مسئلہ بنا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے "صاحب" کا چپراسی بلانے آگیا۔ میں اس کی معیت میں "صاحب" کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے فون کی اطلاع دی۔

"یا خدایا ----- یہ کس کا فون آگیا۔ ابھی تو مجھے اپنے دفتر کے فون نمبر کا علم نہیں ہوا"-----

میں نے حیران ہو کر فون اٹھایا۔

دوسری طرف لائن پر کسی نے کہا خان صاحب آپ سے بات کریں گے اور دوسرے ہی لمحے "خان صاحب" لائن پر تھا۔

"مبارک ہو حنیف صاحب ----- ہم نے کہا تم بھی کیا یاد کرو گے ----- ایسی پوسٹ دلائی ہے کہ ساری زندگی عیش کرتے رہو گے ----- یار بڑے دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آج آؤ ناں ----- انہوں نے یہ کہہ کر میری خیریت دریافت کی اور فون بند کر دیا۔

"خان صاحب کی خصوصی مہربانی سے تمہیں سیٹ ملی ہے۔ بڑی پہنچ والے آدمی ہیں۔ ہم بھی خان صاحب کے تابعدار ہیں ----- میرا بھی سلام انہیں کہنا ----- اور کوئی بھی کام ہو تو بھلا جھجک میرے پاس چلے آیا کرو -----

صاحب بہادر نے جو شکل ہی سے بدکردار دکھائی دے رہے تھے۔ منافقت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو سرا شکریہ جناب"

کہہ کر میں باہر آگیا-----

پہلے روز جب کہ مجھے کام کی سمجھ میں نہیں آتی تھی مجھے قریباً سات سو روپے کی آمدن ہو گئی ----- اب مجھے مزید اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔

شام کو الماس بائی کے ڈیرے پر پہنچا تو یہاں ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملا۔

----- الماس بائی کے خاص کمرے میں خان صاحب اور جیدا شراب نوشی میں مشغول تھے اور الماس بائی ان کی ساقی بنی ہوئی تھی۔

"آؤ آؤ یار حنیف صاحب ----- بھئی مبارک ہو۔"

جیدے نے اٹھ کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے محفل بزم کے تابع اس کے ہاتھ میں اپنا ڈھیلا سا ہاتھ دے دیا۔ حالانکہ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی میرا خون کھولنے لگا تھا۔

"جاوید صاحب جپھی پاؤ جپھی-----"

الماس بائی نے قریب سے کہا۔

اور -----

اس بے شرم نے واقعی مجھے "جپھی" ڈال لی۔

یار میں نے کہا ایک ہی علاقے میں رہ کر تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ ناراض نہیں رہنا چاہیئے۔ اپنے دل صاف کر لو-----"

خان صاحب نے بیٹھے بیٹھے کہا۔

"نہیں خان صاحب ----- ناراضگی کیسی اپنا چھوٹا بھائی ہے -----"

جیدے نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

جواب میں مجھے بھی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دانت نکالنے پڑے۔

"بھئی حنیف باؤ کی ترقی ہوئی ہے ----- اس خوشی میں ایک ایک پیگ حنیف باؤ کے کام کا بھی ہو جائے"-----

یہ کہہ کر خان صاحب نے میرے لیے بھی الماس بائی سے ایک پیگ بنوا لیا حالانکہ وہ فاحشہ جانتی تھی کہ میں شراب نوشی چھوڑ چکا ہوں۔

لیکن ----- وہ تو اپنا قرض وصول کر رہی تھی۔

خان صاحب میں دراصل -----

"اوہ یار چھوڑو ان فضول باتوں کو تم ----- تم کیا اوئے۔ پیو باؤ حنیف موجیں کرو ----- ابھی تمہاری معشوقہ بھی آجائے گی ----- آج ہماری طرف سے بطور خاص جشن منانا"-----

خان صاحب نے میری بات مجھے قریباً جھڑکتے ہوئے کاٹ دی۔

اسے نشہ چڑھنے لگا تھا۔

اور -----

وہ تو عالم ہوش میں اپنی کسی بات کے جواب میں "ناں" سننا پسند نہیں کرتا تھا ----- بدمستی کے عالم میں مجھے کیسے برداشت کرتا۔

"پی لے یار ----- پی لے ----- ہم سے کیا پردہ پیارے"۔

جیدے نے نشیلی آواز میں کہا۔

"ہور کی ----- حنیف باؤ بھی بس ایویں ای-----"

یہ کہتے ہوئے الماس بیگم نے مجھے پیگ تھما دیا۔

اور -----

میں بادل نخواستہ پی گیا۔

خان صاحب کے حکم پر بازار سے خصوصی کھانا آگیا۔ جو ہم سب نے اکٹھے کھایا جس کے بعد خان صاحب ہی کے حکم پر نوری کو میرے سامنے پیش کر دیا گیا۔

اس روز میں نے نشے کی حالت میں ہونے کے باوجود الماس بائی کے گھر پر نوری کے ساتھ غلط حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے لیے اب اس کا یہاں رہنا ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا----- لیکن -----

شراب کے نشے نے مجھے اتنا حواس باختہ بھی نہیں کر دیا تھا کہ میں تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ دیتا۔

یہ نیک جذبات صرف مجھ تک ہی محدود رہے -----

گھر سے میں رات کو کسی دوست کی شادی میں شرکت کا بہانہ کر کے گیا تھا۔ اس لیے دیر سے آنے کا جواز موجود تھا۔

لیکن -----

میں حیران رہ گیا۔

گھر کی سیڑھیوں میں عابدہ میری منتظر تھی۔

"حنیف تمہیں شاید نصیحت نہیں ہوئی----- تم شاید ابھی تک باز نہیں آئے ----- بہت پچھتاؤ گے حنیف تم بہت پچھتاؤ گے ----- اس میراثن سے جان چھڑا لو ----- ورنہ ساری زندگی اس وقت کو روتے رہو گے ----- کیوں اپنے شریف والدین کا بڑھاپا برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو ----- اور کچھ نہیں تو اپنی جوان بہن ہی کی شرم کر لو -----"

اس نے میرا گریبان پکڑ کر قریباً روتے ہوئے کہا۔

"شٹ اپ ----- ذلیل لڑکی ----- تیری یہ ہمت کہ مجھے نصیحتیں کرے۔ جا اپنی ماں اور باپ کو سمجھا -----

شاید ابھی تک شراب کا نشہ میرے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

میں پھٹ پڑا۔

عابدہ نے میری طرف یوں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا جیسے اسے دو ہزار وولٹ بجلی کا جھٹکا لگا ہو -----

اور -----

وہ سسکیاں لیتی نیچے بھاگ گئی -----

میں ہونقوں کی طرح اسے جاتے دیکھتا رہا----- بالکل یوں جیسے کوئی انستھیسیا کا مریض جسے وقت سے پہلے ہوش آجائے اپنے جسم کی چیر پھاڑ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہے لیکن کچھ کہہ نہ سکتا ہو -----

اچانک ہی پچھتاوا میری جان کو آگیا تھا -----

شاید میرا نشہ اتر گیا تھا -----

ماں کے کھانسنے کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔

"کیا بات ہے بیٹا کس سے لڑ رہے ہو -----"

اس نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

"کسی سے نہیں ماں ----- تم سو جاؤ" -----

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اس روز میں ساری رات نہ سو سکا۔ ساری رات میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہا۔ میں نے عابدہ کے ساتھ ابھی گھٹیا زبان میں بات کی تھی۔ ایسا تو میں نے کبھی عام حالات میں بھی نہیں کیا تھا۔ اب تو وہ ہمارے سارے گھر کی محسنہ تھی -----

اس روز پچھتاوے نے ساری رات مجھے ماہی بے آب کی طرح تڑپایا۔ میں اس وقت اس سے معافی مانگنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن ----- ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

وقت صاحب بھی نہیں بیٹھا"-----

میں نے بھی قدرے تلخی سے وضاحت کی۔

"یہ تمہارے اباجی کا نہیں ----- خان صاحب کا کام ہے۔ کرنا ہے تو کرو نہیں تو میں جارہا ہوں"۔

یہ کہہ کر اس نے اٹھنا چاہا۔

"خان صاحب کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے -----

میں نے غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات سے کہا اور اس کی بات سنے بغیر فائل اٹھا کر صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔

جی تو چاہتا تھا اس کا منہ نوچ دوں۔ لیکن ----- مجبوری تھی پراچہ نے ٹھیک کہا تھا جیدے کے بغیر خان صاحب کا گزارہ بھی مشکل تھا اور اسے میرے نزدیک کرنے کا تو سیدھا مطلب یہ تھا کہ جیسے بھیڑ کو بھیڑیے کے سامنے پھینک دیا جائے۔ وہ تو گن گن کر اپنے بدلے لیتا-----

اس کے لیے تو یہ بات ہی ناقابل برداشت تھی کہ میں الماس بائی یا خان صاحب کے حلقہ احباب میں شامل ہوں----- بہرحال یہ "سٹیٹس" کا مسئلہ تھا----- یہ بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ مولوی شریف کا لڑکا اتنے اثر و رسوخ کا مالک؟

صاحب نے معمول کے مطابق فائل پر دستخط کر دیے اور میں نے فائل لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے اپنی مٹھی میں پکڑے تین چار نوٹ "شکریہ" کہہ کر ہاتھ ملانے کے بہانے مجھے پکڑا دیے۔ یہاں رشوت دینے کا یہی طریقہ چلتا تھا۔

میں نے بغیر گنے انہیں کوٹ کی جیب میں رکھ لیا-----

شام تک میرا موڈ خراب رہا-----

میرے لیے جیدے کی یہ دھمکی ناقابل برداشت تھی۔ لیکن ----- مجبوری یہ تھی

کہ اسے ناراض کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

شام کو میں الماس بائی کے ہاں معمول کے مطابق پہنچ گیا-----

آج میں نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ جیدے والا قصہ ختم کر کے ہی جاؤں گا۔

یہیں میں نے الماس بائی سے بھی کہا کہ وہ خان صاحب سے فون پر بات کروا دے۔

وہ تو کسی دوسرے شہر گئے ہیں ----- کیا ہوا باؤ حنیف ہمیں حکم کرو ----- ہم بھی تمہارے ہیں"۔

اس نے بے حیائی کا مظاہرہ کیا۔

لیکن ----- میں سیریس رہا۔

"دیکھو الماس بائی میں ایک بات صاف صاف کہہ دوں۔ یہ جیدے کو میرے متھے نہ لگایا کرو۔ مجھے اس کی شکل سے ہی نفرت ہے۔ خان صاحب کو کہنا جو بھی کام ہو مجھے براہ راست کہہ دیا کریں ----- میں نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا۔

الماس بائی کے لیے تو بلی کے بھاگوں چھنکا ٹوٹا۔

"حنیف باؤ مجھے تو یہ خانہ خراب کی اولاد زہر لگتا ہے۔ میں تو خود خان صاحب کی وجہ سے مجبور ہوں۔ ورنہ اسے جوتے مار کر یہاں سے نکال دیا کروں ----- کل اس نے یہاں بھی بڑی بدتمیزی کی تھی۔

جانتے ہو کیا ہوا؟"

اس نے جان بوجھ کر سوالیہ فقرہ کہا۔

"کیا؟"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"رات شراب کے نشے میں کمبخت یہاں آن مرا اور بضد تھا کہ میں ابھی نوری کو گھر سے بلاؤں لیکن جب سے نوری نے مجھے تمہارے متعلق بتایا ہے میں اسے غیر

مرد کا ہاتھ نہیں لگنے دیتی۔ بڑی دھمکیاں دیتا رہا سالا ---- میں نے بھی کہا بیٹا کر لے جو کرتا ہے"۔

الماس بائی نے سچ کہا تھا یا جھوٹ؟

اس سوال کا جواب تو میرے پاس نہیں تھا۔

لیکن ---- وہ اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب ہو گئی اس کی اس بات نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔

میں نے دیوانہ وار جیدے کو گالیاں بکنا شروع کر دیں۔

مجھے کیا پتہ تھا کہ یہاں تو یہ راون بائیس گز کا ہے؟

الماس بائی کے شیطانی ذہن نے تو کوئی اور منصوبہ تیار کیا تھا۔

وہ تو خود جیدے سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جیدا اس کے اور خان صاحب کے درمیان کباب میں ہڈی بن گیا تھا۔

خان صاحب نے کچھ عرصہ سے اس پر ضرورت سے زیادہ ہی توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ جب سے غیر ممالک میں سختی ہوئی تھی اور حکومت نے بین الاقوامی سمگلنگ پر نظر رکھنی شروع کی تھی۔ اس کے بعد سے خان صاحب کا "اندرون ملک تجارت" پر زیادہ زور ہو گیا تھا اور اس شہر میں جیدا ان کا پرانا ایجنٹ تھا----

جیدے نے اپنے باپ کے سیاسی اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھایا اور بر سر اقتدار پارٹی کے نوجوان ونگ کا مقامی صدر بھی بن چکا تھا جو خان صاحب کے لیے ایک اور اچھا سائن تھا---- انہوں نے اب جیدے پر کچھ زیادہ ہی توجہ دینی شروع کر دی تھی اور اپنے سیاسی کاموں میں بھی اس کا حصہ ڈال دیا تھا۔ جیدے نے بھی اس صورتحال سے مکمل فائدہ اٹھایا اور وہ بھی اب خان صاحب کی کمزوری بن چکا تھا۔

الماس بائی بر سر اقتدار پارٹی کی خواتین ونگ کے عہدے دار تھی----

اس نے چند ماہ بعد کے ہونے والے انتخابات میں اپنے علاقے سے ٹکٹ کی توقع رکھی ہوئی تھی اور خان صاحب کے بغیر ٹکٹ کا حصول ممکن نہیں تھا۔ جب کہ جیدا اس بازار میں اس کی سیاسی حریف شہناز بائی کو آگے لا رہا تھا۔

جب بھی الماس بائی نے اشارے کنایے سے خان صاحب کو اس طرف توجہ دلائی انہوں نے اس کی تسلی کروا دی۔

"خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو الماس بائی۔ ہمارے ہوتے ہوئے کسی کی جرات ہے کہ تمہارے مقابلے میں کسی کو سامنے لائے ----" وہ ایک ہی بات کہہ کر الماس بائی کی تسلی کروا دیتا۔

اس چکر میں اس نے بیک وقت الماس بائی کی دونوں بیٹیوں اور ان کی ماں سے ناجائز تعلقات استوار کر لیے تھے----

الماس بائی کو اس بات کا تو علم ہی نہیں تھا کہ جیدے نے خان صاحب کو شہناز کے گھر کا راستہ بھی دکھا دیا ہے۔

شہناز بیگم اس کی پرانی حریف تھی۔

دونوں نے ماضی میں ایک دوسرے کے "عاشقوں" پر ہاتھ صاف کیے تھے۔

شہناز بیگم کے پاس خان صاحب کے لیے دو کے مقابلے میں چار لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک نک چڑھی ---- کہاں ہفتے میں پانچ چھ چکر الماس بائی کے ہاں لگتے تھے اور کہاں اب مہینے میں دو تین چکروں کی نوبت آ گئی تھی۔

الماس بائی کو تو شاید اپنے لٹنے کی خبر ہی نہ ہوتی وہ تو اس روز اماں پٹھانی نے جو کسی کام سے وہاں گئی تھی خان صاحب کو اس کی چھوٹی لڑکی ثریا کے ساتھ گھوڑے اڑاتے دیکھ لیا تھا اور اس نے بھی ایک لمحے کا توقف کیے بغیر یہ خبر الماس بائی کو پہنچا دی تھی۔

الماس بائی پر تو جیسے آسمانی بجلی گر پڑی -----

یہ تازہ واردات تھی ----- ابھی اس حادثہ کو چند روز ہی گزرے تھے اور وہ تلملاتی ہوئی شیرنی کی طرح اپنے زخم چاٹ رہی تھی جب اسے مجھ ایسے گرے کے منہ سے یہ سنہری الفاظ سننے کو مل گئے۔

شیطان عورت نے شاید اسی روز منصوبہ تیار کر لیا تھا-----

اس نے جیدے کا کانٹا ہی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب اسی منصوبے کا آغاز کیا تھا۔ اس کے منہ سے یہ سن کر کہ جیدا نوری پر نظر رکھتا ہے میری ساری مردانگی جاگ اٹھی ----- والدین کی منت سماجت -----

محلے والوں کے طعنے -----

عابدہ کی طنز-----

قدرت کی طرف سے ملنے والی سزاؤں نے تو میری "مردانگی" کو بیدار نہیں کیا۔

لیکن ایک میراثن کی جنسی ہوس نے مجھے اندھا کر دیا۔



میں اس کا خون پی جاؤں گا----- اس سالے کی یہ ہمت -----"

میں نے اسے گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

"ہائے حنیف باؤ ----- تم غصہ نہ کرو ----- ابھی الماس زندہ ہے۔ میرے جیتے جی اس خبیث نے اگر نوری کی طرف میلی نظروں سے بھی دیکھا تو اس کی آنکھیں نکال دوں گی ----- جانے مولا علی میں نے اسے ہمیشہ اپنی بچیوں کی طرح رکھا ہے ٹھیک ہے پہلے وہ پنکی کے ساتھ جاتی تھی ----- لیکن ----- جب اس نے تمہارے متعلق بتایا ہے اس نے تمام پرانے سلسلے ختم کر دیے ہیں -----

وہ سراسر بکواس کر رہی تھی -----

میں خود نوری اور اس کی بیٹی کا دلال بن کر جا چکا تھا -----

اور -----

وہ میرے ہی سامنے جھوٹ بول رہی تھی ----- لیکن -----

میں نے پھر بھی اس کی بات کو سچ مان لیا۔ اس وقت ہمارا دشمن مشترکہ تھا۔ میرے لیے یہ بڑی خوش آئند بات تھی کہ الماس بائی جیدے سے نفرت کرتی ہے۔ تب مجھے اس نفرت کی "وجوہات" کا علم نہیں تھا۔

ان باتوں کا علم تو مجھے تب ہوا جب سر سے پانی گزر چکا تھا۔

"حنیف باؤ غصے کو تھوک دو ----- حکمت سے کام لو ----- دماغ کو ٹھنڈا رکھو ----- غصے سے صرف ہمارا نقصان ہو گا ----- ہم خان صاحب کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ----- ہوشیاری سے کام کرنا پڑے گا ----- تم سب سے پہلے ایک کام کرو۔"

اس نے سرگوشی سے میرے کان میں کہا۔

"کیا؟"

میں جن گدھوں کی طرح اس اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

"فوراً ہی پستول کا لائسنس بنا لو ----- حنیف باؤ جیدا تمہارا محلے دار ضرور ہے۔ لیکن تم یہ بات شاید نہ سمجھو کہ وہ اصل میں کتنا خطرناک ہے۔ میں تمہیں ایک بڑی ضروری بات بتا دوں لیکن پہلے قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہ تم اس بات کا مرتے دم تک کسی سے ذکر نہیں کرو گے"-----

اس نے اچانک ہی اپنے شیطانی کھیل کا آغاز کیا-----

"کیا بات ہے نہیں کہتا"-----

میں نے حیرانی سے اور تجسس سے پوچھا۔

"پہلے قرآن پر ہاتھ رکھو----- دیکھو حنیف باؤ تم مرد ہو----- تمہارے لیے سارا زمانہ کھلا پڑا ہے۔ لیکن میں عورت ذات ہوں اور عورت بھی خاص طبقے کی----- اس لیے مجھے بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوتا ہے-----"

اس نے مظلومیت کی تصویر بن کر کہا۔

"اچھا اچھا سناؤ"-----

میں نے کہا-----

اور-----

اس نے خدا جانے کسی کتاب پر میرا ہاتھ رکھوا کر اقرار کروا لیا کہ میں جو بات الماس بائی مجھے بتانے جا رہی ہے اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا-----

جس روز خان صاحب نے تمہیں ۶ ہزار روپے دیے تھے----- جیدا اسی روز کوٹھے پر موجود تھا۔ اوپر چوبارے میں شراب پی رہا تھا۔ جب خان صاحب تمہیں پیسے دے کر اوپر گئے اور انہوں نے بتایا کہ تم کچھ گھبرا رہے ہو تو اسی خانہ خراب نے خان صاحب سے کہا کہ اگر تم سے پچاس ہزار روپے چھین لیے جائیں تو تمہارے لیے کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا کیونکہ تم پچاس ہزار روپے دے نہیں سکو گے اور مجبوراً تمہیں وہ کام کرنا پڑے گا----- خان صاحب نے اس کی بات مان لی----- اور حنیف باؤ تم پر وہ حملہ جیدے کے دو ساتھیوں مٹھو اور شفیع نے کیا تھا----- انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے وہ رقم لا کر اسی کمرے میں جیدے کے حوالے کی تھی۔ جس میں سے آدھی رقم اس نے مٹھو اور شفیع کو دے دی تھی-----"

اس نے اپنی بات مکمل کی۔

یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی یا سچ؟

لیکن----- میرے لیے ایک ایک پل قیامت ڈھا رہا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا اس خانہ خراب کا ٹینٹوا دبا دوں-----

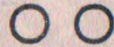
"حنیف باؤ----- میں تمہیں لائسنس بنوا دوں گی۔ ایس پی میرا واقف ہے۔ اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار ضرور رکھا کرو۔ اس موذی کا کچھ پتہ نہیں۔ جس طرح خان صاحب اس پر لٹو ہو رہا ہے----- یہ اسے بے وقوف بنا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میری بات سمجھ گئے ناں"-----

الماس بائی نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔

"بے فکر رہو----- الماس بائی۔ میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں----- میں بھی کوئی الو نہیں بننے والا"-----

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا----- الماس بائی مجھے روکتی ہی رہ گئی----- نوری وہاں نہیں تھی۔

لیکن----- اس روز اس نے اپنی بیٹی پنکی کو میرے لیے میدان میں اتار دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلا آیا۔



میری عقل پر نجانے کیا پردہ پڑ گیا تھا-----

جیدے کا تصور آتے ہی غصے سے میرا خون کھولنے لگتا تھا-----

میں الماس بائی کو یہ تو نہ کہہ سکا کہ وہ نوری کو اپنی نوکری سے ہی "مکتی" دے دے----- البتہ میں نے اس روز پراچہ کے ذریعے ایک غیر قانونی ذریعے سے پستول حاصل کر لیا-----

"خیریت تو ہے ناں"-----

پراچہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اپنی حفاظت کے لیے یار ---- تم تو بتا رہے تھے جیدے کے متعلق ---- اب مجھے یہ یقین ہو چلا ہے کہ اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا ---- اس سے کیا بعید ہے کچھ بھی کر گزرے ---- تم نہیں جانتے پراچہ! میں اس کی رگ رگ کو سمجھتا ہوں ---- یہ سارا خاندان بڑا کینہ پرور ہے ---- میں نے تو گھبراہٹ میں اس کے سر پر بوتل ماری تھی ---- لیکن اب وہ مجھے معاف نہیں کرے گا ---- یار میں تو ایک لاکھ روپیہ پورا ہونے کا منتظر ہوں اس کے بعد اللہ تیری یاری ---- پھر کس کافر نے اس دھندے میں پڑنا ہے ---- کسی دوسرے شہر ہی چلے جائیں گے ---- کم از کم یہ محلہ ضرور بدل لیں گے ---- میں نے پراچہ سے کہا۔

پراچہ ضرور دل ہی دل میں ہنستا ہو گا کہ میں کس چکر میں پڑ گیا ہوں ----

تین چار دن میں الماس بائی کے ہاں نہیں گیا ---- صرف استاد رنگی خان کے گھر جاتا۔ جب سے میں نے پچاس ہزار روپیہ انہیں دیا تھا میں اس گھر کا "دلہا" بن گیا تھا۔

حالات نے ان لوگوں کو بھی فنکار سے کنجر بنا دیا تھا اور دونوں میاں بیوی اکثر ہم دونوں کو اکیلے چھوڑ کر چلے جاتے ----

اس طرح شاید وہ سونے کا انڈہ دینے والی مرغی پر اپنی گرفت مضبوط کر رہے تھے۔

میں بھی نوری کو اب "اپنا مال" سمجھنے لگا تھا۔

بالآخر وہ روز آ ہی گیا جس سے مجھے والد صاحب ڈرایا کرتے تھے۔

اس روز الماس بائی نے مکمل ڈرامہ تیار کرنے کے بعد مجھے آفس فون کیا ----

"کیا بات ہے حنیف باؤ ناراض ہو ہم سے ---- "

اس نے چھٹتے ہی کہا ----

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" ----

میں نے صفائی پیش کی ----

"آج شام کو ضرور آنا ---- نوری بھی ادھر ہی ہے اور پنکی بھی تمہیں یاد کر رہی تھی"۔

اس نے کہا۔

میں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔

یوں بھی اب الماس بائی کے کوٹھے پر جانا میری عادت سی بن گئی تھی۔

مجھے کیا علم تھا کہ الماس بائی نے کس قیامت کی چال چلی ہے اسے علم تھا کہ میں موماً پستول اپنے پاس رکھتا ہوں ----

شام کو میں معمول کے مطابق ہی وہاں گیا تھا ----

پستول میں نے احتیاطاً" اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ دروازے پر ہی ماس بائی نے میرا استقبال کیا وہ قدرے گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" ----

میں نے جاننا چاہا۔

آج سرکار کا ختم تھا۔ گڈی سائیں آئے ہوئے ہیں خدا جانے یہ خانہ خراب ں سے آگیا ---- وہ گڈی سائیں کے ساتھ بیٹھا ہے ---- سائیں جی بھی اس کے نے جاننے والے ہیں۔ میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتی اچھا تم تو اندر آؤ ---- ادھر سرے کمرے میں آجاؤ ----

وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

یہاں نوری اور پنکی بھی موجود تھیں۔

"ماں جی ---- اسے نہ یہاں آنے دیا کرو ---- کہہ دو خان صاحب سے بڑا حرامی ۔ میں تو اس کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی ---- "

پنکی نے مجھے دیکھتے ہی جیدے کو صلواتیں سنا دیں۔

"بیٹی ---- تھوڑی دیر میں خان صاحب آرہے ہیں۔ ان کا فون آیا ہے۔ اچھا ہوا حنیف باؤ ---- سامنے بات ہو جائے گی ----

یہ کہہ کر اس نے بھی جیدے کو تین چار سنا دیں۔

دوسرے کمرے میں جیدے کے قہقہے یہاں تک سنائی دے رہے تھے۔ الماس بائی میرے پاس بیٹھی تھی اور دونوں لڑکیاں دوسرے کمرے میں جا چکی تھیں۔

"حنیف باؤ میں تو ساری زندگی تیری احسان مند رہوں گی۔ جس طرح بھی ممکن ہو آج خان صاحب کے سامنے ساری بات کر دینا" ----

اس نے بڑی چاپلوسی کے انداز میں کہا۔

دوسرے کمرے سے مسلسل جیدے کی اونچی اونچی آوازیں آرہی تھیں ----

وہ شاید گڈی سائیں کے ساتھ کسی بات پر ہنس رہا تھا اور ادھر میرا خون کھول رہا تھا۔ الماس بائی مطمئن تھی کہ ڈرامہ بالکل اس کی عین ہدایات کے مطابق سٹیج ہوا ہے اور ہر اداکار اپنی جگہ موجود ہے ----

"تم بوتل تو پیو ----"

اس نے میرے سامنے ہی پیپسی کولا کی بڑی بوتل کھولی۔

یہ بوتل اس نے پہلے ہی سے تیار کی ہوئی تھی۔ جس میں پیپسی کم اور شراب زیادہ تھی۔ ایک دو گھونٹ میں نے زہر مار کئے تو ذائقہ کچھ بدلا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے بھی سمجھا کہ یہ اصل میں میرے اندر کی تلخی ہے جس نے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا ہے ---- آہستہ آہستہ میں نے سارا گلاس اپنے معدے میں انڈیل لیا۔

خدا جانے یہ کتنی تیز شراب تھی جس نے فوراً ہی میرے حواس کو جکڑ لیا ----

ابھی بمشکل گلاس ختم ہی کیا تھا کہ دوسرے کمرے سے پنکی بھاگتی ہوئی آگئی۔

"کیا بات ہے ---- کیا ہوا؟

الماس بائی نے گھبرانے کی اداکاری کی۔

"ماں جی غضب ہو گیا ---- جیدا زبردستی میرے بیڈ روم میں گھس آیا اور اس نے نوری کو پکڑ لیا ہے ---- ماں جی اسے چھڑائیں ---- وہاں گڈی سائیں بھی ----"

"جیدے ----"

میں نے پنجابی فلموں کے ہیرو کی طرح بڑھک ماری اور ہوش و حواس کھو کر کمرے کی طرف لپکا ---- شراب کا نشہ دماغ کو چڑھ چکا تھا۔

میرے سامنے کا منظر میرے تن بدن میں آگ لگانے کے لیے کافی تھا۔ نوری کو جیدے نے صوفے پر گرایا ہوا تھا اور دونوں شیطان اس سے چمٹے ہوئے تھے ----

"شیطان مجھ پر مکمل غالب تھا ----

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جیدے کی طرف بڑھا اور اسے کالر سے پکڑ کر پوری قوت سے کھینچ کر پرے پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گڈی سائیں کے منہ پر پوری قوت سے طمانچہ رسید کر دیا۔

جیدا تلملا کر اٹھا اس نے کونے میں رکھا ہوا گلدان اٹھایا اور میری کمر پر پوری قوت سے مارا۔ نوری دیوانہ وار چیخ چلا رہی تھی۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ ڈرامہ اتنا "حقیقی" بھی ہو جائے گا۔

اس سے پہلے کہ جیدا میز پر دھرا اپنا پستول اٹھائے میں نے جیکٹ کی جیب سے پستول نکالا اور تین گولیاں اس کے سینے اور سر میں اتار دیں ----

گڈی سائیں نے چاہا کہ بھاگ کر نکل جائے۔

لیکن ---- باقی گولیاں میں نے دیوانہ وار اس پر فائر کر دیں ---- تمام گولیاں اس کی کمر میں لگیں ----

اس دوران الماس بائی اور پنکی "بچاؤ ---- بچاؤ" چیختی نیچے بھاگتی گئیں ----
نوری نے بھی ان کی تقلید کی ----

اگلے ہی لمحے میرا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ میرے سامنے جیدے کی لاش پڑی تھی جس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں شاید اس نے مرتے دم تک اتنے شدید رد عمل کی توقع نہیں کی ہو گی ---- اسے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ ورنہ وہ نوری پر ہاتھ نہ ڈالتا ----



پولیس کب آئی ----

تھانیدار نے میرے ہاتھ سے پستول کب چھینا۔

مجھے کس نے ہتھکڑی لگائی؟

تھانے جانے تک میرے حواس ہی قائم نہیں تھے۔ تھانے کی حوالات میں بند ہوتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

مجھے اچھی طرح سمجھ آگئی کہ میرے ساتھ کیا ظلم ہو گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں نے اپنے ساتھ کیا ظلم کر ڈالا ----

ساری رات پولیس والے مجھے مارتے اور گالیاں دیتے رہے ----

اگلے روز صرف میرے والد یا دفتر کے ایک دو آدمی مجھے تھانے میں ملنے آئے ---- میں نے خان صاحب کی طرف پیغام بھیجا اور "مدد کے وعدے" کے ساتھ ہرکارہ واپس لوٹ آیا ---- پولیس نے میرا ایک ہفتے کا ریمانڈ لیا ----

میں نے پریس کو بھی بتایا کہ ہمارا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا کیونکہ مجھ پر جیدے نے قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔ پولیس کو ہماری سابقہ دشمنی کا علم تھا۔

نوری کا ذکر میں نے اس لیے گول کر دیا کہ وہ تو تھی ہی میری ---- الماس بائی نے

دوسرے ہی روز مجھ سے تھانے میں ملاقات کر کے کہا تھا کہ میں اپنے بیان میں صرف اپنا اور جیدے کی دشمنی کا ذکر کروں۔ اگر نوری کا نام بھی لیا تو پولیس والے اس کو بھی تفتیش میں شامل کر دیں گے۔ جس کے بعد کیا ہو گا؟" اس کا مجھے بخوبی احساس تھا۔

میں نے وہی کیا جو الماس بائی نے کہا تھا ----

صرف اس لیے کہ نجانے مجھے کیوں امید تھی کہ وہ مجھے بچالے گی۔ خان صاحب میری مدد کو آئیں گے اور نوری میرے قبضے میں آجائے گی۔

لیکن ---- ایسا کچھ نہیں ہوا۔

میرے بیانات مکمل ہونے پر ان لوگوں نے مجھ سے کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ الماس بائی مجھے باقاعدہ کھانے بھجواتی رہی شاید وہ لوگ ابھی تک اس ڈرامے کے آخری منظر پر کام کر رہے تھے۔

ریمانڈ ختم ہونے پر مجھے جیل بھیج دیا گیا ----

جیل جانے پر بھی میرے دماغ سے عشق کا بھوت نہیں اترا۔ میں نے نوری کی ماں کو پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ اپنے صدیوں کے مریض نظر آنے والے والد کو میں نے رو رو کر ساری داستان سنائی اور کہا کہ میری رقم سے کسی وکیل کا بندوبست کر لیں ----

انہوں نے احاطہ بیلی رام جانے سے صاف انکار کر دیا کسی نہ کسی طرح میرے کہنے پر وہ پراچہ کو ملاقات کے لیے لے آئے۔

پراچہ پہلے تو آنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ والد کے اصرار پر آگیا۔ میرے توقعات کے عین مطابق وہ بالکل بدل چکا تھا۔

طوطے کی طرح اس کی آنکھیں ماتھے پر لگ گئی تھیں۔

میں نے منت سماجت کر کے اسے کہا کہ وہ ایک مرتبہ نوری کے ہاں جائے اور

کچھ پیسے ہی لا دے۔

اسے بھی پانچ ہزار کا لالچ دیا-----

پراچہ چلا گیا-----

اگلے روز عدالت میں اس نے بتایا کہ استاد رنگی خان اس کی بیوی اور نوری نے میرا نام سنتے ہی بے شمار گالیاں دی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں وہاں صرف گانا سیکھنے جایا کرتا تھا بعد میں میری گندی حرکتوں کی وجہ سے انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا----- آئندہ اگر میں نے ان کی بیٹی کا نام اپنی گندی زبان سے لیا تو بہت برا ہو گا----- "میں عدالت میں دیکھ لوں گا----- سب حرام زادوں کو ننگا کر دوں گا"-----

میں نے غصے سے چیختے اور بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"اوئے ہوش کر اوئے----- یہ تیری ماں کا گھر نہیں----- حوالات ہے سالے اب بدمعاشی دکھائی تو ڈنڈہ بیڑی لگوا دیں گے"-----

موٹی سی توند والے تھانیدار نے مجھے گالیاں دے کر خاموش کروا دیا-----

پراچہ میرے سلام کا جواب دیے بغیر واپس چلا گیا۔



اس روز جب میں تاریخ بھگت کر جیل واپس پہنچا تو ڈیوڑھی میں مجھ سے "ہیروئن" کی پڑیا برآمد کر لی گئی-----

میں سناٹے میں آ گیا-----

لیکن----- مجھے اپنے دشمنوں کی طاقت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ کسی نے میری ایک نہ سنی اور وہ لوگ مجھے "چکر" میں لے گئے۔ یہاں چار پانچ جیل نمبرداروں نے حوالدار کے اشارے پر مجھے ڈنڈوں سے وحشیانہ انداز میں پیٹنا شروع کر دیا۔

میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا----- جب بے ہوش ہوا تو انہوں نے اٹھا کر

ایک کوٹھڑی میں پھینک دیا۔ ساری رات میں درد سے کراہتا رہا لیکن جواب میں صرف گالیاں ملیں----- کسی نے مجھے ایک گولی تک درد کی نہیں دی-----

تین روز تک میں حرکت کرنے کے لائق ہی نہ تھا۔ چوتھے روز ایک شخص میری ملاقات کے لیے جیل کے اس بند احاطے میں آ گیا۔

"امید ہے تمہاری عقل ٹھکانے آ گئی ہو گی----- آج کے بعد اگر کبھی تمہاری زبان پر الماس بائی خان صاحب یا کسی اور کا نام آیا تو یاد رکھنا ہم جیل میں الارم کروا کر تمہیں کتے کی موت مروا دیں گے----- تم ابھی خان صاحب کو نہیں جانتے----- شکر کرو کہ زندہ ہو----- عدالت میں وہی بیان دینا جو تم نے تھانے میں دیا تھا----- اس کے علاوہ ایک لفظ بھی تمہاری زبان پر نہ آئے----- یاد رکھنا تم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہو-----"

یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ گیا۔

مجھے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی-----

میری حیثیت تو اس سسٹم میں پر کاہ جتنی بھی نہیں تھی-----

میں نے خاموشی اختیار کر لی-----

اپنی زبان کو دانتوں تلے دبا لیا-----

دو سال تک میرا بوڑھا باپ، میری ماں اور عابدہ ملاقات کے لیے آتے رہے۔

والد صاحب نے خدا جانے کہاں کہاں سے بھیک مانگی۔ کیسے وکیل کی فیس اکٹھی کی اور ایک وکیل بھی کر لیا----- جیل والوں نے میرا نام "چپ شاہ" رکھ لیا تھا-----

میں نے ساری زندگی اپنے باپ کے کہنے پر جس طرز عمل کو نہ اپنایا۔ جیل کی ایک ہی چھینٹی نے اس راہ پر لگا دیا۔

دو سال میں میری عمر ۲۰ سال زیادہ ہو گئی-----

جیل والوں نے میری عزت کرنی شروع کر دی تھی ----- جیدا میری گولیوں سے موقع پر مر گیا تھا ----- گڈی سائیں زندہ رہا ----- لیکن، زندہ در گور -----

گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لگی تھی جس سے اس کا سارا جسم ہی مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ ریڑھی پر ڈھیر ہو کے کسی کونے میں پڑا رہتا تھا اور راہ گیر اس پر بھیک پھینک کر چلے جاتے تھے -----

شاید قدرت اسے نشان عبرت بنا کر زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس درمیان اگر والدین اور خدا کے بعد کسی نے مجھے سہارا دیا تو وہ عابدہ تھی -----

عدالت میں روزانہ جج میرے رویے کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بہت سوالات پوچھے۔

لیکن ----- میں نے وہی کہا جو تھانے میں کہہ آیا تھا۔

خدا جانے جج کو میری حالت پر کیا رحم آیا۔ اس نے قتل کو "فوری رد عمل" قرار دے کر میری سزا میں قدرے نرمی کر دی اور مجھے کل ملا کر دس سال کی قید بامشقت دے کر جیل بھیج دیا۔

جس روز میرا فیصلہ ہوا۔ اس سے تین روز بعد رمضان المبارک کے پہلے ہی دن میرے والد مولوی محمد شریف ریٹائرڈ ہیڈ کلرک کا فیصلہ بھی آ گیا۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا اور چھٹی -----

میری حالت پر رحم کھاتے ہوئے مجھے پولیس کی حراست میں والد کے آخری دیدار کروانے لے گئے -----

جب تک اپنے شہر کی جیل میں رہا۔ بوڑھی ماں، بہن اور کبھی کبھی عابدہ بھی ملنے آتی رہی -----

لیکن کب تک؟

میرا تبادلہ دوسرے ضلع کی جیل میں ہو گیا -----

تین سال بعد ایک روز اس جیل میں میری ماں نے مجھے بتایا کہ دینو پہلوان نے زبردستی عابدہ کو گوجرانوالہ میں اپنے کسی بھانجے کے ساتھ بیاہ دیا ہے -----

شاید والد صاحب کی ریاضت کا پھل تھا کہ میرے ایک دور پار کے ماموں کو ہماری حالت پر رحم آ گیا اور وہ لوگ میری بہن کو بیاہ کر لے گئے۔

جیل میں میرے نیک کردار کی وجہ سے میری سزا میں دو سال معافی مل گئی۔ اب میری رہائی میں چھ ماہ باقی ہیں۔

گزشتہ سات آٹھ ماہ سے میری ماں ملنے نہیں آ سکی۔ وہ دق کی مریض بن چکی ہے۔ بہن کو میں نے شادی کے بعد التجا کر کے منع کر دیا تھا کہ وہ اب کبھی مجھے جیل میں ملنے نہ آئے۔

عابدہ تین بچوں کی ماں بن چکی ہے -----

سوچتا ہوں جب چھ ماہ بعد یہاں سے رہا ہو کر جاؤں گا تو زندگی ایک مرتبہ پھر اپنی تمام تر وحشتوں کے ساتھ جبڑے کھول کر میری منتظر ہو گی -----

تب میں کیا کروں گا؟

میرے لیے دعائیں مانگنے والا باپ تو اب رہا نہیں -----

میری افلاطون محبت میں مبتلا عابدہ اب میری زندگی سے نکل گئی ہے ----- میری ماں شاید ہی چھ ماہ مزید جی پائے۔

اور -----

باؤ امین کے گھر دیکھی فلم کی ہیروئن نوری نے تو سات سال پہلے ہی مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا -----

اپنے گناہوں کا کفارہ شاید مجھے اب اکیلے ہی ادا کرنا پڑے! شاید اکیلے ہی!!